منظور شدہ لائبریری کتب محکمہ تعلیم پشاور ریجن بمطابق سرکلر نمبر T.B.C./255-6 مورخہ ۸ جنوری ۱۹۵۸ء

رموزِ فطرت

یعنی

حکیم الامت علامہ اقبال کی فارسی تصنیف ’ارمغانِ حجاز‘
کا اُردو زبان میں منظوم و مکمل ترجمہ

از

عبد الرحمٰن طارق بی، اے

ناشران
حاجی ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب اشاعت منزل بل روڈ لاہور
(پاکستان)

نقش اوّل نومبر سنہ ۱۹۵۰ء ۱۰۰۰ جلد

قیمت مجلّد .. .. .. تین روپے

ملک محمد عارف پرنٹر و پبلشر نے اپنے دین محمدی پریس لاہور میں
چھپوا کر شائع کی۔

من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و تبر بیگانہ سازد مردِ غازی را

اقبالؒ

فہرستِ عنوانات

نوٹ: اس کتاب میں صفحہ نمبر اصل فارسی کتاب "ارمغانِ حجاز" کے صفحہ نمبر کے عین مطابق ہے۔ اس طرح قارئین کو اصل اور ترجمہ کی تطبیق میں کسی قسم کی دقّت نہیں ہوگی!

طارقؔ اور خدمتِ اقبالیات

"میرے دوست حضرتِ طارقؔ علامہ اقبالؒ کے اُن عقیدتمندوں میں سے ہیں جنھوں نے حقیقتاً اپنی زندگیاں علامہ اقبال کے پیغام کی نشر و تبلیغ کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ طارقؔ صاحب نے متعدد ضخیم تالیفات کے ذریعے سے کلامِ اقبال کے اکثر پہلوؤں کو روشن کیا ہے، اور عام پڑھے لکھے انسانوں کو علامہ کے ادب و شعر اور اُن کی تعلیمات پر غور کرنے کا موقع بہم پہنچایا ہے۔ وہ سرتاپا تعلیماتِ اقبال کے نشے میں چُور ہیں اور چاہتے ہیں کہ دُوسروں کو بھی اُس نشے میں سرشار کر دیں۔"

طارقؔ صاحب نے قسّامِ ازل سے شعر گوئی کے لئے ایک فطری اور ذہنی صلاحیت پائی ہے۔ وہ از سرتاپا ایک اسلامی شاعر ہیں۔ شارعِ اسلام، دینِ اسلام، فلسفۂ اسلام اور سیاسیاتِ اسلام سے انھیں والہانہ عشق ہے۔ علامہ اقبال کے فارسی کلام کو سمجھنے اور اس کے مطالب و معانی سے بہرہ اندوز اور متاثر ہونے کے لئے بہرحال ایک خاص درجے کے علم کی ضرورت ہے

عوام اور کم خواندہ اشخاص اُن کے کلام سے براہِ راست مستفید نہیں ہو سکتے لیکن طارق صاحب نے عام فہم انداز میں علّامہ کے مطالب کو نظم کر کے اُن کے افادے کے دائرے کو وسیع تر کر دیا ہے۔ اقبال کی فارسی نظموں کے تراجم سے اُن کا مقصد صرف یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے علّامہ مرحوم کا نقطۂ نگاہ اور ان کی تعلیمات عوام تک پہنچ جائیں۔ میرے نزدیک یہ بہت بڑی خدمت ہے، اور طارق صاحب مستحقِ مبارکباد ہیں کہ وہ اِس خدمت کو بوجہِ احسن انجام دے رہے ہیں!"

لاہور
یکم دسمبر ۴۹ء

(مولانا) عبدالمجید سالک

تراجم پر ایک نظر

(از مولانا عبدالرحمٰن صاحب شوق مدیر ماہنامہ عارف لاہور)

عام طور پر نثر میں بھی ترجمے کا حق ادا کرنا اور اس کی صفات و مقتضیات سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہونا ایک نہایت دشوار امر ہے۔ چہ جائیکہ علامہ اقبال کی فارسی منظومات کو، جو اکثر دقیق فلسفیانہ افکار و تصورات سے معمور ہیں، اُردو نظم کا لباسِ جمیل پہنایا جائے۔ لیکن طارق صاحب جس چابکدستی، قادرالکلامی، حسنِ انداز، چستیٔ بندش اور رسائیٔ مفہوم کے ساتھ اقبال کے فارسی کلام کو اُردو میں منتقل کر گئے ہیں، وہ اُن کے خامۂ عنبر شمامہ کا ایک معجز نما اور محیر العقول کارنامہ ہے چونکہ میں ذیل میں متعدد تراجم اصل فارسی رباعیات سمیت آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں لہٰذا تراجم کی فنی خوبیوں کے متعلق کوئی طویل مضمون لکھنا ایک غیر ضروری تکلف معلوم ہوتا ہے۔ قارئینِ کرام کا ذوقِ سلیم اور احساسِ شعر و نغمہ تراجم کے لفظی و معنوی محاسن کا از خود اندازہ کرے گا۔ فنی اور افادی حیثیت سے "ارمغانِ حجاز" کا یہ اُردو ترجمہ اپنی عظمت و تکمیل پر شاہدِ عادل ہے۔ میں یہاں اس قدر ضرور عرض کر دوں گا کہ طارق صاحب کا ترجمہ صرف مکمل "ترجمہ" ہی نہیں، بلکہ اکثر جگہ علامہ

اقبال کے اصل معانی و مقاصد کی نہایت دلپذیر، حقیقت رس اور بصیرت افروز تشریح و توضیح بھی ہے۔ اس طرح طارق صاحب ایک خاص ادبی سلیقے سے "بیک کرشمہ دو کار" کا حق ادا کر گئے ہیں، اور یہ اپنی قسم کی وہ پہلی خوبی ہے جو عہدِ حاضر کے دیگر تراجم میں نہیں پائی جاتی۔ الغرض تراجم کو بہ نگاہِ انصاف مطالعہ کر لینے کے بعد بلا تامل اِس حقیقتِ صادقہ کا اعلان کیا جا سکتا ہے، کہ وقت کے مستند ترین شارحِ اقبالیات (طارق) نے اُردو ادب میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا حکمت افزا اور رُوح پرور کارنامہ پیش کیا ہے۔ فارسی زبان پر عبور نہ رکھنے والے عاشقانِ کلامِ اقبال فارسی تصنیفاتِ اقبالؒ کے معانی سمجھنے کے لئے نہایت تشنہ و مضطرب رہا کرتے تھے۔ طارق صاحب نے یہ تراجم پیش کر کے اُن کے لئے افکارِ اقبال کے کچھ نئے زندگی بخش چشمے کھول دئیے ہیں۔ اب اِن سے کماحقہٗ سیراب ہونا اُن کے اپنے ذوق و شوق پر منحصر ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

محبت از نگاہش پائیدار است — سلوکش عشق و مستی را عیار است

مقامش عبدہٗ آمد ولیکن — جہانِ شوق را پروردگار است

ترجمہ

اُس نبیؐ ہی کی نگاہوں سے ہے اُلفت پائیدار — جس کا مسلک ہو چکا ہے عشق و مستی کا عیار

ہے شریعت میں اگرچہ "عبدہٗ" اس کا مقام — قلب اس کا ہے جہانِ شوق کا پروردگار

جوانے خوش گلے رنگیں کلاہے — نگاہِ او چو شیراں بے پناہے
بہ مکتب علمِ میشی را بیاموخت — میسّر نایدش برگِ گیاہے

ترجمہ

وہ جواں مسلم کہ تھا جو خوش گِل رنگیں کلاہ — اور نظر بھی اس کی تھی مانندِ شیراں بے پناہ
جب سے سیکھا علمِ میشی مدرسے میں بیٹھ کر — اب نہیں اس کو میسر ایک بھی برگِ گیاہ

بیا بر خویش پیچیدن بیاموز — بناخن سینہ کاویدن بیاموز
اگر خواہی خدا را فاش بینی — خودی را فاش تر دیدن بیاموز

ترجمہ

اپنے باطن ہی میں ہر دم پیچ کھانا سیکھ لے — سینے کو ناخن سے لالہ گوں بنانا سیکھ لے
گر تمنا ہے کہ دیکھے تو خدا کو بے حجاب — فاش تر کرنا خودی کو خود کو پانا سیکھ لے

مَنہ از کف چراغِ آرزو را — بدست آور مقامِ ہاؤ ہو را
مشو در چار سوئے ایں جہاں گم — بخود باز آ و بشکن چار سو را

ترجمہ

ہاتھ سے ہرگز نہ رکھ غافل چراغِ آرزو　　اور کر ہمت سے حاصل پھر مقامِ ہاؤ ہو!
چار سو سے دہر میں ہستی نہ کر اپنی فنا　　رہ خودی سے باوفا اور توڑ قیدِ چار سو!

تو ہم مثلِ من از خود در حجابی　　خنک روزے کہ خود را باز یابی
مرا کافر کند اندیشۂ رزق　　ترا کافر کند علمِ کتابی

ترجمہ

ہے مری مانند ابھی تیری خودی زیرِ حجاب　　خوب ہے اب بھی الٹ دے گر تو باطن سے نقاب
مجھ کو کافر کر رہی ہے ہر گھڑی فکرِ معاش　　کر گیا کافر تجھے لیکن فقط علمِ کتاب

ز علمِ چارہ سازے بے گدازے　　بسے خوشتر نگاہِ پاکبازے
نکوتر از نگاہِ پاکبازے　　دلے از ہر دو عالم بے نیازے

ترجمہ

علمِ چارہ ساز ہو انساں کا جب بے گداز　　اُس سے بہتر ہے مسلماں کی نگاہِ پاکباز
اور نگاہِ پاک بیں سے ہے کہیں بہتر وہ دل　　ہو غنا دنیا میں جس کا دو جہاں سے بے نیاز

مسلماں فقر و سلطانی بہم کرد ‌ ‌ ‌ ضمیرش باقی و فانی بہم کرد
ولیکن الاماں از عصرِ حاضر ‌ ‌ ‌ کہ سلطانی بہ شیطانی بہم کرد

ترجمہ

دستِ مسلم نے کیئے ہیں فقر و سلطانی بہم ‌ ‌ ‌ اس کے دل میں ہو چکے ہیں باقی و فانی بہم
الاماں، اس دور کے مکر و فسوں سے الاماں ‌ ‌ ‌ مل گئی ہے اس میں سلطانی و شیطانی بہم

بجامم تو کہن مے از سبو ریز ‌ ‌ ‌ فروغِ خویش را بر کاخ و کو ریز
اگر خواہی ثمر از شاخِ منصورؒ ‌ ‌ ‌ بہ دل لا غالب الا اللہ فرو ریز

ترجمہ

جامِ نو میں ڈال دے کہنہ شرابِ مشکبو ‌ ‌ ‌ نور سے اپنے منور کر دے پھر یہ کاخ و کو
چاہتا ہے گر ثمر تو شاخ سے منصورؒ کی ‌ ‌ ‌ دل میں اپنے نقش کر لے معنئ الا اللہ ھو

درافتد با ملوکیت کلیمے ‌ ‌ ‌ فقیرے بے کلاہے بے گلیمے
گہے باشد کہ بازی ہائے تقدیر ‌ ‌ ‌ بگیرد کارِ صرصر از نسیمے

ن

پادشاہوں سے بھی ٹکراتا ہے گاہے اک کلیم — بے تفنگ و بے کلاہ و بے رفیق و بے گلیم
یوں بھی ہوتا ہے کہ اکثر کھیل میں تقدیر کے — کام طوفانوں کا دے جاتی ہے اک موجِ نسیم

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است — نظامش خام و کارش ناتمام است
غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم — کہ در دینش ملوکیت حرام است

ترجمہ

ہے ابھی تک اس جہاں میں آدمی زادہ غلام — خام ہے اُس کا نظام اور کام اُس کا ناتمام
میں تو بندہ ہوں سراسر اس نبیؐ کے فقر کا — دین میں جس کے ملوکیت ہوئی مطلق حرام

دل آں بحر است کو ساحل نورزد — نہنگ از ہیبتِ موجش بلرزد
ازاں سیلے کہ صد ہامون بگیرد — فلک با یک حبابِ او نیرزد

ترجمہ

دل وہ قلزم ہے کہ ساحل سے ہے جس کو اجتناب — خوف سے اُس کے نہنگوں کا ہے زہرہ آب آب
دشت صد ہا ڈوبتے ہیں قلب کی جس سیل میں — ہے فلک بھی اُس کی پہنائی میں گویا اک حباب

مسلمانے کہ داند رمزِ دیں را — نساید پیشِ غیر اللہ جبیں را
اگر گردوں بہ کامِ او نہ گردد — بکامِ خود بگرداند زمیں را

ترجمہ

جو مسلماں بھی سمجھتا ہے جہاں میں رمزِ دیں — رکھ نہیں سکتا کبھی وہ پیشِ غیر اللہ جبیں
حسبِ منشا اُس کے گر چکّر نہ کاٹے آسماں — اپنی منشا کے مطابق وہ چلاتا ہے زمیں

مقامِ عشق بے صدق و یقیں نیست — یقیں بے صحبتِ روح الامیں نیست
گر از صدق و یقیں داری نصیبے — قدم بیباک نہ کس در کمیں نیست

ترجمہ

عشقِ حق حاصل نہیں ہوتا بلا صدق و یقیں — اور یقیں ملتا نہیں بے صحبتِ رُوح الامیں
گر یقین و صدق سے ہے بہرہ ور تیری جبیں — رکھ دلیری سے قدم، منزل میں کچھ خطرہ نہیں

ع

چہ حاجت طول دادن داستاں را | بحرفے گویم اسرارِ نہاں را
جہانِ خویش با سوداگراں داد | چہ داند لامکاں قدرِ مکاں را

ترجمہ

کیا ضرورت ہے کہ میں لمبی کروں یہ داستاں | اک دو حرفوں میں بیاں کرتا ہوں اسرارِ نہاں
دے دیا سوداگروں کے ہاتھ میں اپنا جہاں | لامکاں والے کو کیا معلوم ہے قدرِ مکاں

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم ہست | بہشتے بہرِ اربابِ ہمم ہست
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش | بہشتے فی سبیل اللہ ہم است

ترجمہ

ایک جنت بن چکی ہے بہرِ پاکانِ حرم | دوسری جنت بھی ہے اک بہرِ اربابِ ہمم
اک بہشتِ مفت بھی ہے اے تن آساں مسلمو | مست و خوش اس میں ہو اور مت کرو کچھ رنج و غم

ف

"ارمغانِ حجاز"

تحفۂ ایمان دیتی ہے تجھے رُوحِ حجاز
اور اُس ایمان کا ہے ترجماں یہ ارمغاں!
عشقِ حق، عشقِ نبیؐ، عشقِ خلافت، عشقِ دیں
اِس کتابِ پاک کے ہے نقطے نقطے میں نہاں!

ص

حریّت کا غیر فانی درس ہے اس کا کلام
حُسنِ فطرت کی جِلا ہے اس صحیفے کی زباں!

مخزنِ حکمت ہے جو قطعہ بھی اِس کا دیکھیے
بند ہے کوزے میں گویا ایک بحرِ بے کراں!

وہ عمل جس سے کہ پائے فردِ ملّت کا جلال
کر دئیے ہیں حضرتِ اقبالؔ نے اس میں بیاں!

ہے اگر مطلوب تجھ کو شوکتِ علم و عمل
اے مسلماں! اِس کے معنی کو بنا لے حرزِ جاں!

اِس حقیقت کی بشارت دے رہی ہے یہ کتاب
سب ہیں فانی اِس جہاں میں تُو مگر ہے جاوداں!

ق

یہ بتاتی ہے کہ "مومن" ہی ہے روحِ کائنات
اور کرتی ہے تجھے قلب و نظر کا پاسباں!

اس کے شعرِ عطر زا سے ہو اگر تُو فیض یاب
دل ترے سینے میں ہو جائے گا رشکِ گلُستاں!

مَیں بتاؤں کب تلک اِس کی تجھے وجدانیات
ذوقِ صالح خود معانی کا بنے گا رازداں!

مَیں تو اتنا جانتا ہوں، اس کے سوز و کیف سے
پیر بھی واللہ بن سکتا ہے اک مردِ جواں!

اس کے پڑھنے سے ہمیں ملتا ہے ایمانِ کلیم
یہ مسلماں کو دکھاتی ہے صراطِ مستقیم!

طارق

دیباچہ

میرے نزدیک علامہ اقبالؔ کے فارسی کلام کا بہترین حصّہ اُن کے قطعات ہیں۔ نہ صرف چستیٔ بندش، حُسنِ ترتیب اور فصاحت و بلاغت ہی کے لحاظ سے وُہ عدیم النظیر ہیں، بلکہ اصلاحی، تعمیری اور افادی حیثیت سے بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ چنانچہ "ارمغانِ حجاز" ایسے ہی فارسی قطعات کا بصیرت افروز مجموعہ ہے۔ جس میں عشقِ حق، عشقِ رسولؐ اور عشقِ قوم و ملّت اپنے پُورے تموّج پر ہے۔ یہ قطعات اوّل تا آخر حکمت و موعظت کے انقلاب انگیز عناصر سے معمور ہیں اور مسلمان کو غیرت و حریّت، حفظِ خودی، سخت کوشی، عزم و استقلال اور حق گوئی و حق پرستی کا ناقابلِ فراموش درس دیتے ہیں۔ لفظی اور معنوی ہر دو لحاظ سے اِن کا مقام اس لئے بھی بلند تر ہے کہ یہ علامہ اقبالؒ

کے آخری حصّۂ عمر کی تخلیق ہیں، جب کہ حکیم الاُمّت کے فکر و نظر کا پر پرواز زمان و مکان کی رسمی حدود کو توڑ کر عالمِ لاہُوت کی سیر کیا کرتا تھا، اور قلبِ حق اندیش ہمہ وقت عشق و مستی کے بحرِ ناپیداکنار میں غرق رہتا تھا۔

فارسی اگرچہ مسلمانوں کی ایک موقّر، شیریں اور جواہرِ علم و ادب سے معمور زبان ہے، تاہم جو لوگ پاکستان میں تسلّی بخش طور پر اس زبان سے باخبر ہیں، انھیں اُنگلیوں پر گِنا جا سکتا ہے۔ اوّل تو بذاتِ خود فارسی زبان کے جاننے اور سمجھنے والے ہی بہت کم ہیں، چہ جائیکہ علّامہ اقبال کی فارسی شاعری کے اسرار و غوامض تک رسائی ہو، جو فلسفیانہ اندازِ بیان کی وجہ سے عموماً دقیق و عمیق واقع ہوئی ہے!

پس مَیں نے "ارمغانِ حجاز" کو اُردو نظم میں اس لئے منتقل کیا ہے کہ جو لوگ فارسی زبان پر حاوی نہیں، وہ علّامہ اقبال کے اُن حیات افروز افکار و احساسات سے فیضیاب ہوں جو اُن کے فارسی کلام میں تجلّی ریز ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن عقیدتمندانِ اقبال نے عموماً علّامہ مرحوم کا اُردو کلام پڑھا اور اُس کے زندگی بخش تاثّرات سے

محظوظ و مستفید ہوئے، وہ فارسی کلام کو سمجھنے کے لئے بھی ماہیِ بے آب کی مانند بے چین رہے ہیں۔ مَیں نے اُن کے باطنی اضطراب اور ذوق و شوق کا مکمل طور پر اندازہ کیا اور پھر اُن کا یہ معنوی مطالبہ پورا کرنے کے لئے ہمہ تن منہمک ہو گیا۔ چنانچہ یہ تراجم (جو اکثر جگہ تشریح کا فرض بھی از خود بجا لا رہے ہیں) اُسی احساس کا حاصل و نتیجہ ہیں۔ مَیں نے ترجمہ کرتے وقت اِس اصول کو پیشِ نظر رکھا ہے کہ علامہ اقبال کا حقیقی مفہوم و مقصد کہیں بھی فوت نہ ہو، اور فارسی قطعات کے مطالب و معانی اُردو میں ایک بے تکلّف اور غیر تغیّر یافتہ صورت میں منعکس ہو جائیں۔ چنانچہ آپ کا ذوقِ صحیح اصل اور ترجمہ ہر دو کے مطالعہ سے اِس موضوع کے متعلق از خود ایک آزاد و منصفانہ فیصلہ مرتّب کر سکتا ہے!

مَیں اِس ضمن میں امامِ فن مولانا عبدالمجید صاحب سالک کا خاص طور پر ممنون و شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اِس کتاب کا مسودہ اوّل تا آخر نہایت غور و خوض سے ملاحظہ فرمایا۔ ہر ہر شعر کو اپنے بے مثل عیارِ تنقید پر پرکھا، اور متعدد جگہ لفظی و معنوی ہر دو لحاظ سے

خ

ایسی حسین و دلپذیر اصلاحیں دیں جن سے تراجم کی فنّی حیثیت کو چار چاند لگ گئے!

عبدالرحمٰن طارق



۱

حضورِ حق

خوب ہے وہ بھی مسافر جو نہ لے سامان و ساز
اور دِل بھی بے پسندِ یاراں سے ہو اُس کا بے نیاز
تُو جو سینہ کھولے اُس کے نالۂ پُرسوز پہ
رنجِ صد سالہ مٹا دے اُس کی اِک آہِ گداز!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضورِ حق

بے دلوں نے قلب میرا لے لیا رخصت ہوئے
اُن کا شعلہ بھی بالآخر بجھ گیا رخصت ہوئے
آہ، عوام النّاس کی محفل میں ہے اب جلوہ ریز
خاص لوگوں نے تو غم بھی پی لیا رخصت ہوئے!

○

تھی محلِ گفتگو اب تک مری بُود و نبُود[1]
اِس ندامت سے نہ پائی میرے ہونٹوں نے کشود
زندہ مَردوں کے ہیں سجدوں سے تو خود ہی باخبر
دیکھ! ہیں میرے عمل کے ترجماں میرے سجود!

○

چاہتا ہے دِل مرا ہر دم کشادِ چون و چند[2]
ہے نظر اُس کی مہ و خورشید و پرویں سے بلند
دِل کو میرے کر عطا ویرانۂ دوزخ میں کہیں
کیونکہ یہ کافر ہے فطرت میں بہت خلوت پسند

[1] بُود: ہستی۔ نبود: عدم۔ [2] چون: کائنات کی کیفیت۔ چند: تعدادِ اشیاء

۵

○

شورش کیسا بپا اس جسمِ آب و گل میں ہے
عشق اک دل کے عمل سے ہر گھڑی مشکل میں ہے
اک نفس کا چین بھی مجھ پر ہُوا یکسر حرام
یا الٰہی ، رحم! بجلی کون سی اِس دل میں ہے؟

○

کِس کی قدرت نے نمایاں کر دیا ہے یہ جہاں ؟
حُسنِ بے پردہ ہے کس کا ذرّے ذرّے سے عیاں ؟
مجھ سے فرماتا ہے تُو شیطان سے کر اجتناب
تُو بتا شیطان کو کس نے کیا ہے بے عناں[1]

[1] بے عناں : بے لگام ۔ آزاد

○

دل مِرا بے قید ہے کھاتا ہے ہر دم پیچ و تاب
ہے غضب تیرا مری قسمت میں یا لطف و خطاب؟
قلبِ شیطاں کو بھی میں آزردہ کر سکتا نہیں
گاہے گاہے تو گنہ بھی ہے مرا کارِ ثواب!

○

آہ ساقی! جامِ مے کو ہم ترستے ہی رہے
غیر اصحابِ یمیں[1] کا حق بھی لے کر چل دیے
دوستی کی رسم اگر یہ ہے تو اے عشقِ غیور
مار دیوارِ حرم سے، جام و مینا توڑ دے!

[1] اصحابِ یمیں: داہنی طرف والے لوگ۔

○

عاشقانِ خود کمند دل میں رہتے ہیں اسیر

ہو کے یکسر درد بھی رہتے ہیں درماں ناپذیر[1]

کر طلب مجھ سے نہ سجدے تو کہ شاہانِ جہاں

اک دہِ[2] ویراں سے ہوتے ہی نہیں محصول گیر!

○

گامزن اُس رہ پہ ہوں جس کی کوئی منزل نہیں

بیج وہ ڈالے زمیں میں، جن کا کچھ حاصل نہیں

کثرتِ غم سے میں دُنیا میں نہیں ڈرتا، مگر

دے نہ وہ غم جو کہ میرے قلب کے قابل نہیں

[1] درماں ناپذیر: دوا قبول نہ کرنے والے ، [2] دہ : گاؤں ،



یا الٰہی! مے کو میری رکھ تنک جاموں سے دُور
یہ شرابِ پختہ ہے، کر اس لئے خاموں سے دُور
خوب ہے گر نیستاں سے دُور چنگاری رہے
قلبِ خاصاں کو یہ دے، رکھ عام انسانوں سے دُور



کش مکش سے ہجر کی محروم ہے تیری طلب
دل میں تیرے ہے کہاں یہ درد و داغ و تاب و تب
لامکاں سے اِس لئے گھبرا کے ہیں نے کی گریز
ہیں وہاں مفقود یکسر نالہ ہائے نیم شب!



کر مِرے حملوں سے تو معمورِ شورش یہ جہاں
ضرب سے میری بدل نقشِ زمین و آسماں
خاک سے میری اُٹھا اک آدمِ محشر طراز
محو کر دے دہر سے یہ بندۂ سود و زیاں



اِس جہاں کو تیرہ تر کرتا ہے نورِ آفتاب
درحقیقت ہے ثواب اس کا سراپا ناثواب
کچھ نہیں معلوم کب تک دہر کے ویرانے کو
خونِ آدم ہی سے تو دیتا ہے گا رنگ و آب



ہوں ترا بندہ، مرا مقصد ہے بس تیری رضا
تیری راہِ راست ہی پر میں سدا چلتا رہا
تو اگر دے حکم مجھ کو خر کو کہہ اسپِ اصیل
منحرف ہو جاؤں گا، کہنا نہ مانوں گا ترا



دل مرے سینے میں ہے لیکن ہے بے کیف و سرور
خاک میں میری ہے ناپیدا ازل کا سوز و نور
ہے ثوابِ ذکر بھی میرے لئے تو بارِ دوش
چھین لے مجھ سے الٰہی یہ نمازِ بے حضور!



میں بیاں کیسے کروں یہ قصّۂ دین و وطن
آشکارا کہہ نہیں سکتا کہ ہے نازک سخن
کیوں خفا ہوتا ہے، تیری سرد مہری کے طفیل
میں نے دُنیا میں بنایا ہے وہی دیرِ کہن[1]!



قید میں افرنگ کی ہے جسمِ مسلماں کا وجود
اُس کا دِل بھی قید ہے، ہوتی نہیں جس کی کشود
جس جبیں کو میں نے رکھا ہے درِ اغیار پر
بوذرؓ و سلمانؓ کے ممکن ہی نہیں اُس سے سجود

[1] "دیرِ کہن" سے مراد ہیں بُتانِ وہم و گمان جو بعثتِ نبوی سے پیشتر عرب میں عام تھے۔



مدّعا میرا نہیں ہے یہ جہاں یا وہ جہاں
بس یہی کافی ہے مجھ کو، جانتا ہوں رمزِ جاں
دے مجھے سجدے بھی ایسے جن کے سوز و کیف سے
وجد میں آنے لگیں تیرے زمین و آسماں!



مردِ تن آساں ہوں، کیا ہے مجھ سے تیرا مدّعا؟
جو ہوا بھی چل پڑی، میں ساتھ اُس کے اُڑ گیا!
مجرمِ جاوید کو سجدے میں دیکھا میں نے آج
سُرخ ہوا اُس کی سحر سے چہرہ میری شام کا



ایسی مِلّت میں مجھے مطلوب ہے دِل کی کُشاد
واعظ و مفتی ہیں جس کے بے یقین و کم سواد
وہ بھی چیزیں دیکھ لیں، جو دید کے قابل نہیں
کاش میں پیدا نہ ہوتا، زیست ہے وجہِ فساد!



تیری چشمِ غیظ ہم پر شعلہ افشاں تابکے؟
اور بُتانِ حاضر و موجود رقصاں تابکے؟
اِک صنم خانہ ہے دُنیا، اِس میں اولادِ خلیلؑ
ہو کے مومن سائلِ نمرود و شیطاں تابکے؟



کیا خبر اُٹھے نہ اُٹھے پھر سرودِ دل گداز
کیا خبر آئے نہ آئے اِس طرف بادِ حجاز
اِس فقیرِ رہ نشیں کا وقت تو ہوتا ہے ختم
دہر میں آئے نہ آئے پھر کوئی دانائے راز!



دہر میں آئے بھی میرے بعد اگر دانائے راز
اُس کی فطرت کو عطا کر اِک نوائے دِل گداز
اُمتوں کے دِل کو شرک و کفر سے کرتا ہے پاک
یا کلیمِ پُر جلال و یا حکیم نے نواز!



دہر میں پہنچی ہے میری اک دلِ درد آشنا
میری قسمت میں جو آئی تو فغانِ نارسا
خاکِ مرقد پر مری خوشتر ہے لالہ کی نمود
کیونکہ وہ فطرت میں ہے خاموش اور خونیں نوا



یہ کسی کے دل کو لا سکتا نہیں ہے زیرِ دام
درد و غم مفقود ہے سینے میں اور فطرت ہے خام
تو نے اس انسان میں پھونکی ہے اپنی روحِ پاک
کھانے مرنے کے سوا جس کو نہیں ہے کوئی کام

○

قلب میرا میرے پہلو سے گریزاں ہی رہا
غرقِ صورت ہو کے معنی سے رہا ناآشنا

ہم سے تو وہ رانندۂ[1] درگاہِ حق ہے خوب تر
اُس نے دیکھا وہ خدا ہم نے فقط جس کو سُنا

○

جانتا کچھ بھی نہیں جبریل میرے ہائے و ہو
کیونکہ مخفی اُس سے ہے آدم کا ذوقِ جستجو

پوچھ دردِ عشق اپنے بندۂ بیچارہ سے
کیونکہ یہ کھائے ہوئے ہے نیش و نوشِ[2] آرزو

[1] مُراد شیطان
[2] نیش و نوش : تلخی اور شیرینی

○

گرچہ مثلِ ماہ میں گردش سے کم ہوتا رہا
تیری شب کی انجمن کو حسن تو میں نے دیا
گفتگو جس بزم میں تیرے تغافل پر ہوئی
میں تری حرمت[1] میں اس محفل سے فوراً اٹھ گیا



آسماں نے بھی نہ دیکھا ہوگا ایسا روزگار
جس کی غفلت پر ہے خود جبریل کا دل بیقرار
کفر نے جو بھی بنایا اس میں دیرِ خوش نما
"مومنِ مشرک" اسے پوجا کیا لیل و نہار

[1] حرمت بمعنی عزت ہے

○

دِل کو میرے سوزِ خسروؔ، شورِ رومیؔ کر عطا
گفتگو میں صدق و اخلاصِ سنائیؔ کر عطا
اُس مقامِ خاص پہ پہنچی ہے میری بندگی
مَیں نہیں لوں گا اُسے، تُو گو "خدائی" کر عطا

○

عہدِ حاضر کا ہے مسلم فاقہ مست و ژندہ پوش[1]
اور ہیں اس کے عمل جبریلؔ کو وجہِ خروش
آ، نئی ملّت کریں اِس دیرِ کہنہ سے بپا
کیونکہ یہ ملّت ہے دنیا کے لئے اب بارِ دوش

[1] ژندہ: گدڑی، چیتھڑا۔



وہ نئی ملّت، کرے جو دہر میں برپا خروش
اور ہنر جس کا بنائے نیشِ[1] کو بھی رشکِ نوش[2]
ایسی ملّت، ایک ہی عالم پہ جو قانع نہ ہو
بلکہ قوت سے کرے ہر دو جہاں کو زیبِ دوش!



ایک ایسی زندہ ملّت، جس کا ذِکرِ لا اِلٰہ
قلبِ شب سے آشکارا کر دے نورِ صبح گاہ
ایک ایسی قوم، منزل جس کی ہو خورشید و ماہ
اور ریگِ کہکشاں بن جائے جس کی گردِ راہ!

[1] نیش: زہر [2] نوش: شہد۔

حکم ہے تیرے جہاں کا مردِ خس[۱] کے لئے
کس[۲] ہے مغلوبِ ستم ہر فردِ ناکس کے لئے
کارخانوں میں کبھی دیکھو جا کے جب، اہلِ ہنر
مثلِ قمری مرتے ہیں عیشِ کرگس[۳] کے لئے!



پیر سے کہنے لگا اک دن مریدِ فاقہ مست
ہے مرا خالق بھی میرے حال سے بے خبر
شاہ رگ سے گرچہ ہے نزدیک تر اس کا وجود
پیٹ سے پاتا نہیں ہوں اس کو میں نزدیک تر!

۱؎ خس: کمینہ، کنجوس۔ ۲؎ کس: قابل اور روشن طبع شخص ۳؎ کرگس: گدھ۔



ہے دگرگوں آج کل یہ کشورِ ہندوستاں
اور نرالے رنگ میں ہیں وہ زمین و آسماں
کر نہ ہم سے تو نمازِ پنجگانہ کی طلب
ہے غلاموں کے لئے کارِ صف آرائی گراں



ہو رہا ہے آج محکومی سے مسلم خود فروش
اور سلطاں اس پہ ہے فیاضِ طلسمِ چشم و گوش
جو رہِ محکومی سے آگے شستہ ہیں ان میں نہیں
ہو رہی ہے اب شریعت بھی انہیں کی آرائش



کرمِ معیّن بھی کہیں اندازۂ سود و زیاں
مثلِ جنّت اس جہاں کو دے حیاتِ جاوداں
دیکھ! تیرے آدمِ خاکی کی محنت کے طفیل
رشکِ فردوسِ بریں ہے آج تیرا خاکداں



گو تجھے معلوم ہے کیا ہے حیاتِ جاوداں
تجھ کو لیکن کیا خبر کیا شے ہے مرگِ ناگہاں!
تیرے اوقاتِ ابد سے ایک دم ہوگا نہ کم
جاوداں ہو جائیں ہم تو اس میں کیا تیرا زیاں؟

○

جب کہ ہو زیر و زبر یہ عالمِ سُود و زیاں
اور ہر مخفی عمل ہو حشر میں یکسر عیاں
کر نہ رسوا ہم کو پیشِ خواجہؐ ہر دو سرا
بے حسابِ عاصیاں تو چشم سے اُس کی نہاں!

○

تن ہے میرا ناتواں اور جاں ہے گرمِ ترکتاز[1]
سوئے معمورہ ہے جس میں خواجہؐ ذرّہ نواز
تُو یہیں رہ، محفلِ خاصاں میں غرقِ عیش ہو
مَیں تو کوئے یار میں جا کر پڑھوں گا اب نماز!

[1] ترکتاز : دوڑ دھوپ

حضورِ رسالتؐ

ادب گہ ایک زیرِ آسماں ہے عرش سے نازک
نفس گُم کردہ آتے ہیں جنیدؒ و بایزیدؒ اِس جا

حضورِ رسالتؐ

چھوڑ دے خیمے کو، میرے ساتھ آ خیمہ نشیں!
کیونکہ رہبر بھی ہمارا واقفِ منزل نہیں
عقل تھک کر رہ گئی، محمل ہے محرومِ سفر
دستِ دل میں باگ دیں، محکم کریں اپنا یقیں!



میں سدا دیکھا کیا اپنے ہی دل کی آب و تاب
اور اسی کاشانے میں پایا سکون و اضطراب
شہر و قریے کی ہوا سے میں نے کی ہر دم گریز
کیونکہ بادِ دشت میں پاتا ہے میرا دل شباب



کیا خبر کس کی نظر نے کر دیا دل کو فگار
اِک نفس کو بھی اِسے حاصل نہیں ہوتا قرار
دشت میں جب لے گیا دل کو، ہُوا افسردہ تر
جب کنارِ آبِ جُو آیا تو رویا زار زار



پوچھ مت جاتا کہاں ہے اہلِ دل کا کارواں
چھوڑ کر سارا جہاں، ہیں کوئے جاناں کو رواں
روح میں ان کی ہے آوازِ جرس سے یوں خروش
جس طرح موجِ ہوا سے ہو نیستاں کا سماں!



عالمِ پیری میں یثرب کی طرف میں چل دیا
اور سرورِ عاشقانہ سے ہُوا نغمہ سرا
اُس پرندے کی طرح صحرا میں جو وقتِ مسا[1]
پر کُشا ظلمت میں فکرِ آشیانہ سے ہُوا

[1] وقتِ مسا: شام کا وقت۔



پختہ لوگوں کی دلیلوں کو کیا قسمت نے خام
اور گناہِ عشق و مستی بزمِ دُنیا میں ہے عام
مَیں ہوں آہنگِ حجازی پر یہ نغمہ گا رہا
بادۂ یثرب سے کر دے اب مِرا لبریز جام



ہم نشیں! مت پُوچھ تُو میرے مقاماتِ نوا
دوست کیا جانیں کہاں سے مَیں ہُوا ہوں رونما
مَیں نے صحرائے عرب میں اس لئے کھولا ہے رخت[1]
تاکہ خلوت میں رہوں مستِ نوا، نغمہ سرا

[1] رخت : سامان



صبح ناقے سے کہا میں نے کہ آہستہ سے چل
کیونکہ راکب ہے ترا بے طاقت و بیمار و پیر
میرے کہنے پر ہوئی وہ اور بھی یوں تیز رَو
ریگِ صحرا بھی ہے گویا پاؤں کے نیچے حریر!



ساربان! ناقے کو میری باندھ مت کوئی مہار
مثل میری رُوح کے ہے روح اُس کی بھی بصیر
مجھ پہ ظاہر کر رہی ہے اُس کی یہ موجِ خرام
ہے طلسمِ[1] قلب میں میری طرح وہ بھی اسیر!

[1] طلسمِ قلب : دل کا جادو ، مراد عشق ؛



اشک سے لبریز ہے ناقے کی بھی چشمِ سیاہ
دردِ دل میرے لئے ہے اُس کی آہِ صبح گاہ
وُہ شرابِ عشق جس سے دل مرا روشن ہُوا
پے بہ پے برسا رہی ہے اُس کی بھی موجِ نگاہ



خُوب ہے صحرا کہ جس میں حسبِ فرمانِ ودود
کارواں ہو چل رہا اور لب پہ ہو اُس کے درود
ایسے صحرا میں جبیں فرسا ہو ریگِ گرم پر
تاکہ ماتھے سے ہو ظاہر تابشِ[1] داغِ سجود

[1] تابش : روشنی



خوب ہے صحرا کہ جس کی شام بھی ہے صبح خند
رات ہے کوتاہ اُس کی اور دِن بے حد بلند
راہرو! للہ رکھ اپنا قدم آہستہ تر
ہے مری مانند ہر ہر ذرّہ اِس کا دردمند



اے امیرِ کارواں! یہ کونسا ہے اجنبی؟
جس کی موسیقی ہے آہنگِ حجازی سے تہی
وحشت کی خلوت میں ہے اِس شان سے نغمہ سرا
رشکِ جنّت جس سے ہو صحرا میں اپنی زندگی!

○

عشق و مستی کا مقام اِس مرد کی منزل سمجھ
آتشِ "اللہ ہُو" تخمیرِ آب و گِل سمجھ
ہے نوا اِس کی ہر اک انساں کے دِل کو ساز گار
یعنی ہر سینے میں اِس غازی کی قاشِ دل سمجھ

○

بِن کہے میرا غمِ پنہاں ہوا سب پر عیاں
گر کروں اُس کو بیاں، کہنی پڑے اک داستاں
راستہ پُر پیچ ہے، راہی ہے خستہ اور زار
شمع اُس کی مُردہ ہے اور شب ابھی ہے درمیاں



دشت میں لالہ اُگاتی ہے ہوائے نو بہار
ریگِ صحرا پر ہیں خیمہ زن مرے سب دوستدار
مجھ کو ہے لیکن وُہی خاموش تنہائی عزیز
جس میں بیٹھا ہوں کنارِ آبجوئے کوہسار!



ہوں میں اشعارِ عراقی پر کبھی تو نغمہ خواں
اور کبھی گفتارِ جامی سے ہوں میں آتش بجاں
گو میں آہنگِ عرب کا محرم و ماہر نہیں
ہے زباں لیکن شریکِ نغمہ ہائے سارباں



کر مسافر کا غمِ الفت نشاط آمیز تر!
اور کر آہ و فغاں کو بھی جنوں انگیز تر!
ہے یہی بہتر کہ لے اے ساربان راہِ دراز
تاکہ ہو سوزِ جدائی دِل میں میرے تیز تر



ہم نفس! آ مِل کے روئیں، عشق کا پائیں جلال
ہم محمدؐ کے ہیں دونوں کشتۂ شانِ جمال
پائے خواجہؒ پر ملیں آنکھیں کہیں دل کی مُراد
ہے اِسی درگاہ کی اُلفت میں مومن کا کمال!

○

اہلِ حکمت کو یہاں حاصل نہیں کچھ امتیاز
بلکہ ناداں کو عطا کرتے ہیں مستی کا فراز[1]
کس قدر خوش بخت ہے اور کتنا خرّم روزگار
آہ! جس درویش پر سلطاں کا دروازہ ہو باز!

○

ہے مری آغوش میں مخفی جہانِ چارسُو
مَیں مگر رکھتا ہوں سیرِ لامکاں کی آرزو
طاقتِ پرواز گردِ راہ بن کر گر گئی
جب اُڑائیں چھوڑ کر دُنیائے دُوں کے کاخ وکُو!

[1] فراز: بلندی



وادیٔ یثرب میں ہو جاتے ہیں فانی جاوداں
اِس زمیں سے بے صُوَر[1] ہوتے ہیں سب معنی عیاں
ہے حکیموں اور کلیموں میں یہاں ربطِ کمال
'لن ترانی'[2]، اِس جگہ کہتی نہیں کوئی زباں!



وہ مسلماں جو رہا اب تک فقیرِ کج کلاہ
آج رخصت ہو رہا ہے اُس کے دل سے سوزِ آہ
قلب کیوں نالاں ہے اُس کا یہ بھی وہ سمجھا نہیں
اک نگاہِ لطف اِدھر بھی، یا رسول اللہ نگاہ!

۱۔ صور: جمع صورت ۲۔ یعنی تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا!



میری تاب و تب کا منبع ہے تری الفت کا غم
ہے مرے سوزِ نوا میں بھی تری تاثیرِ دم
رو رہا ہوں اِس لئے پیہم کہ مُلکِ ہند میں
ایک محرم[1] بھی نہیں تیرا، کرم مولا کرم!



شب جو ہے ہندی غلاموں کی، نہیں اُس کی سحر
اِس زمیں پر مہر کا ہوتا نہیں ہرگز گزر
گوشۂ چشمِ محبّت اِس طرف وا کیجئے
ہم مسلمانوں سے کوئی بھی نہیں بے چارہ تر!

[1] محرم : رازدار



کیا مسلماں کی کہوں، جو تھا فقیرِ دردمند
اصل میں اعمال میں بے حد نجیب[1] و ارجمند
سخت جاں مسلم کا ہو اللہ حافظ اور نصیر
خاک پر آ کے گرا ہے چھوڑ کر بامِ بلند



عرض میں کیونکر کروں ملّت کا اپنی حالِ زار
جانتا ہے تُو مرے دِل کا نہان و آشکار
اُن دو صد سالوں سے جو گزرے ہیں اُمّت پر تری
کندۂ قصّاب کی صورت ہے دِل میرا فگار[2]

[1] نجیب: شریف، بلند فطرت۔ [2] فگار: زخمی

○

چرخِ نیلی فام ابھی ہے بہرِ مسلم کج خرام
کاروانِ ملّت کا ہے اب بھی بہت دُور از مقام
کیا کہوں اُس کا عمل کتنا ہے محرومِ نظام
جانتا ہے تُو کہ ملّت ہے ابھی تک بے امام

○

بے نصیب سوز ہے مسلم کا اب تک خونِ ناب
کر سکی لالہ نہ پیدا اِس کی یہ کشتِ خراب
اِس کے کیسے کی طرح خالی رہا اِس کا نیام
اور طاقِ خانۂ ویراں پہ رکھی ہے کتاب[1]

[1] کتاب: مُراد قرآنِ مجید۔



قلب کو مسلم نے کر ڈالا اسیرِ رنگ و بو
اُس کے سینے میں نہیں وہ ذوق و شوق و آرزو
کس طرح سمجھے یہ اب شانِ صفیرِ شاہباز
کیونکہ کانوں کو ہے مچھر کی صدا سننے کی خو!



بند قدرت نے کیا ہے بہرِ مسلم دل کا باب
اُس کی مشتِ خاک میں اب تک خودی ہے محوِ خواب
ہے ضمیر اُس کا تہی تکبیر کی آواز سے
اور حریمِ ذکر بھی اُس کی ہے ویران و خراب

۱؎ صفیر : آواز



جی رہا ہے وہ گریباں چاک، بے فکرِ رفو!
کچھ نہیں معلوم کیونکر زندہ ہے بے آرزو
اس کی قسمت میں لکھی ہے ایک مرگِ ناتمام
جس مسلماں کے نہیں ہے قلب میں اللہ ھُو!



اُس کا حق دے جو کہ ملّت میں ہے مسکین و اسیر
اُس کی غیرت جاوداں ہے گرچہ وہ خود ہے فقیر
کر دیا تقدیر نے اُس پر درِ مے خانہ بند
کشورِ ہندوستاں میں ہے مسلماں تشنہ میر



اک جہانِ نَو کا مولد پھر ہے مُسلم کا دِل
اور پھر اک بار ہوں پاکیزہ اِس کے آب و گِل
تیز ہے طوفانِ باد اور اس کا دامن چاک چاک
دیکھنا بُجھ ہی نہ جائے یہ چراغِ مضمحل!



ہے عروسِ زندگی بھی محفلِ مسلم میں غیر
کیونکہ اقلیمِ فنا میں وہ کیا کرتا ہے سَیر
یہ وہ عاصی ہے کہ پیشِ موت اُترا قبر میں
ہے کلیسا سے نکیر اِس کا تو منکر اہلِ دیر!



چشم سے اُس کی ہُوا مفقود وہ نُور و سرور
اور سینے میں نہیں موجود قلبِ ناصبور
ہو خُدا ہی دوست ایسی اُمّتِ مرحوم کا
موت کا جس کی ہے باعث ایک جانِ بے حضور



موت کا محرم نہیں ہے موت ہی کا اِس کو غم
موت سے لرزاں ہے جب تک ہے بدن میں اِس کے دم
مَیں نے دِل دیکھا نہ اِس کے سینۂ صد چاک میں
چند انفاسِ فسردہ اور غمِ مرگ و عدم!



ہے ملوکیّت جہاں میں سربسر اک شیشہ باز
اور فتنوں میں اِسی کے گھر گئے رُوم و حجاز
دوستوں کا غم بیاں کرتا ہوں میں تیرے حضورؐ
ہے یہ وقتِ دل نوازی اور تُو ہے دل نواز!



جسم ہے مردِ مسلماں کا قوی و پائے دار
اور بِنا بھی اُس کے پیکر کی نہایت استوار!
جب طبیبِ نکتہ رس نے دیکھ لی اُس کی نگاہ
وہ یہ بولا "ہے خودی اِس کے جسد میں رعشہ دار"



ہے مسلماں دہر میں اب شرمسار و بے کلاہ
دین اس کا مر چکا اور فقر نے لی خانقاہ!
جانتا ہے تو کہ دنیا میں مری پونجی ہے کیا؟
ایک کملی، رشک جس پر کر رہے ہیں پادشاہ!



پوچھ مت احوالِ مسلم ہے وہ خود تجھ پر عیاں
ہے زمیں بھی بد گہر اس کی مثالِ آسماں
پرورش تو نے کیا جس مرغ کو انجیر سے
آج صحرا میں تلاشِ دانہ ہے اس پر گراں!



چشمِ مسلم کو دِکھایا مَیں نے رازِ زندگی
اور عیاں مَیں نے کیا ہے نکتۂ فرداوِدی
ہو کرم تیرا تو سرِّ جاں کہوں مَیں فاش تر
خواہشِ نُطقِ عرب رکھتا ہے تیرا اعجمی!



گو مسلماں ہے جہاں میں آج بے خیلؔ و سپاہ
ہے ضمیر اُس کا مگر اب بھی ضمیرِ پادشاہ
پھر عطا مسلم کو ہو جائے اگر اُس کا مقام
ہے جمال اُس کا یقیناً اک جلالِ بے پناہ

ؔ خیل : لشکر۔

○

شیخ کا دامن ہے معمورِ اساطیرِ کہن[1]
اور بنائے گفتگو ہے اُس کی بس تخمین و ظن[2]
شک سے ہے اسلام اُس کا آج بھی زنّار دار
ہے حرم گویا کہ دیر اور شیخ ہے خود برہمن

○

ہے دِگرگوں آج لادینی سے احوالِ جہاں
جسم پرشیدا ہیں سب بھولے ہیں لیکن قدرِ جاں
فقر کی برکت سے، جو بخشا گیا صدیق[رض] کو
مرکزِ ہنگامہ کر دے پھر یہ جانِ ناتواں!

[1] اساطیرِ کہن: پرانے قصے
[2] تخمین: اندازہ ۔ ظن: شک و شبہ



اب حرم بھی لے رہا ہے دیر ہی سے رنگ و بُو
آج ہے دل سب ہمارا پیرکِ ژولیدہ مو
تُو نہ پائے گا ہمارے سینۂ تاریک میں
ایک بھی دل، جس میں ہو موجود نُورِ آرزو



جب تلک تھے مسجدوں سے باوفا طاعت گزار
ہم فقیروں نے کیا شاہوں کا دامن تار تار
آتشِ توحید جب سینوں میں مُردہ ہو گئی
صرف درگاہوں پہ ہم کرنے لگے دل کو نثار

لے پیرکِ ژولیدہ مو : پریشان بالوں والی بڑھیا۔



آج اپنوں سے مسلماں ہو گئے گرمِ ستیز
بغض و نفرت کی نہیں ہیں وہ دائم تخم ریز
روتے ہیں گر غیر اک بھی اینٹ اس مسجد سے لے
عمر بھر کرتے رہے ہیں آپ وہ جس سے گریز!



پیشِ غیر اللہ ہم نے پے بہ پے سجدے کئے
مثلِ گبراں پیشِ بُت محوِ ترنم بھی ہوئے
غیر کا رونا نہیں، روتا ہوں اپنے حال پر
یا نبیؐ! ہم جیسے تیری شان کے لائق نہ تھے!



مے کشوں کے ہاتھ میں مدّت سے ہے خالی ایاغ[1]
کیونکہ ساقی نے ہماری بزم سے پایا فراغ
مثلِ گوہر آہ کو سینے میں رکھتا ہوں نہاں
یا نبیؐ! بنیاد ہے اس دُود[2] کی نیرا چراغ!



مدرسہ طے کردہ راہوں کو کئے جاتا ہے طے
خانقاہوں کے سبو میں بھی نہیں اک قطرہ مے
شاعروں کی بزم سے میں اُٹھ گیا افسردہ دل
مُردہ نغمے ہی بپا کرتی ہے ہر دم اُن کی نے

[1] ایاغ : پیالہ [2] دود : دھواں



مَیں ہوں فطرت میں مسلماں اور غریبِ ہر دیار!
قلب کو میرے نہیں قیدِ مکانی سازگار

باوجودِ ناتوانی ہوں مَیں وقفِ پیچ و تاب
کیونکہ غیر اللہ سے ہوتا ہے مجھ کو پھر دُچار!



تُو نے بخشے تھے جو شہپر اُن سے مَیں اُڑتا رہا
اور ہمیشہ اپنے سوزِ نغمہ سے تڑپا کیا

مومنِ قاہر کہ جس سے موت بھی چھپ جائے موت
دہر میں ڈھونڈا بہت، لیکن نہ وہ مجھ کو ملا!



پیشِ حق رویا کیا اک رات میں زار و نزار
اور کہا مسلم ہے کیوں دُنیا میں یوں برباد و خوار؟
ناگہاں آئی ندا مسلم ہے اتنا کور ذوق
دِل تو رکھتا ہے مگر دِل میں نہیں رکھتا نگار![1]



کیوں کروں اب میں بیاں اپنی گزشتہ قرّ و فال
فائدہ کیا گر سناؤں آج میں ماضی کا حال
تھامے سینے میں روشن اک چراغِ نور پاش
جو گزشتہ دو صدی میں ہو گیا نذرِ زوال

[1] نگار : معشوق



جو نگہباں تھا حرم کا، آج ہے معمارِ دیر
مر گیا اُس کا یقیں، اب دیکھتا ہے سوئے غیر
کر رہا ہے خود عیاں مُسلم کا اندازِ نگاہ
وجہِ یاس اس کو نظر آتے ہیں سب اسبابِ خیر!



سوز جو رکھتا ہے تیرا یہ فقیرِ رہ نشیں
اس کی برکت ہی سے ہے مسلم کو قلبِ آتشیں
روشن و پائندہ کر اس کے دلِ خوابیدہ کو
اُن امیدوں سے کہ پیدا جن کو کرتا ہے یقیں!



مَیں کبھی گرتا ہوں مستی میں کبھی ہوں گرم خیز
اور بغیرِ تیغ و خنجر ہو رہا ہوں خون ریز
ڈال دے مجھ پر خُدارا اک نگاہِ التفات
کیونکہ مَیں ہوں عصرِ حاضر سے ابھی محوِ ستیز!



مجھ کو تنہائی عطا کر اور دے آہ و فغاں
سوئے یثرب چاہتا ہوں اک سفرِ بے کارواں
ہے کہاں میخانۂ شوق اور کہاں مکتب کا روگ!
تو بتا مکتب ہے بہتر یا کہ شوقِ بے کراں؟



مَیں نے اُڑ کر دیکھ لی اُس کی فضائے دلپذیر
پر کو پُر نم کر گیا اُس چرخ کا ابرِ مطیر[1]
دل میں میرے جاگزیں جب سے ہُوا عشقِ جرم
مَیں نے بھی وہ کچھ کہا، کہتا تھا جو اُس کا ضمیر



راز جو مَیں نے بتایا، اُس سے ہیں یہ دُور دُور
نخل سے میرے نہ کھائی ایک بھی آکر کھجور
اے اسیرِ امتحاں! مَیں ہوں تجھی سے دادخواہ
مجھ کو یہ سمجھے غزل خواں، ہے جہالت کا وفور!

[1] ابرِ مطیر: برسنے والا بادل



میرے نغموں کو نہ دے تو شعر کا ہرگز خطاب
چہرۂ معنی سے مَیں نے تو اُٹھائی ہے نقاب
اِس توقّع پر کہ شاید عشق کر دے اُس کو زر
مفلسوں کے مس[1] کو مَیں نے کی عطا یہ آب و تاب!



تُو نے فرمایا کہ دے درسِ حیاتِ جاوداں
مُردہ دل لوگوں کے کانوں کو سُنا پیغامِ جاں
مجھ سے کہتے ہیں مگر اس قوم کے حق ناشناس
ہم کو لکھ دیں آپ تاریخِ وفاتِ این و آں!

[1] مس: تانبا۔



دردِ دل سے ہیں مرے رخسار مثلِ زعفراں
خوں کے قطرات برساتی ہے چشمِ ارغواں
مدّعا میرا گلو میں بن گیا آ کر گرہ
حال میرا بن کہے ہی تجھ پہ ہے ہر دم عیاں



ہم غریبوں کی زباں بنتی ہے گویا اک نگاہ
اور حدیثِ دردمنداں ہے ہمیشہ اشک و آہ
چشم تو کھولی ہے ہیں نے، بند لیکن ہونٹ ہیں
کیونکہ مسلک میں ہمارے ہے سخن یکسر گناہ



منکرِ خود کو کیا میں نے خودی سے آشنا
پیکرِ گِل سے کیا ہے چشمۂ زم زم بپا
کر عطا وہ آتشیں نالہ کہ جس کے سوز سے
جُز غمِ دیں دہر کے ہر رنج و غم کو دوں جلا



جسم میں میرے نہیں کچھ بھی بجز دو دِ نفس
جُز ترے ہاتھوں کے کوئی بھی نہیں ہے دسترس
تُو بتا کس کو سُناؤں اپنے غم کی داستاں
جبکہ سینوں میں بھی ہے آباد تیری ذات بس!



ہے ترا بندہ غریبِ دردمند و نے نواز

اپنے نغموں ہی سے جس کا قلب ہوتا ہے گداز

جانتا ہے تو کہ میرا مقصدِ اعلیٰ ہے کیا؟

قلبِ زندہ، جو رہے دونوں جہاں سے بے نیاز



باد سے مجھ کو نہیں ہے رنگ و نم کی آرزو

مَیں تو فیضِ مہر سے تیرے ہی پاتا ہوں نمو!

ہے نظر میری مقامِ ماہ و پرویں سے بلند

مَیں نہیں کرتا کسی کے حسبِ خواہش گفتگو!



عشق کے دریا کا دُنیا میں کوئی ساحل نہیں
رہنما کوئی وہاں عشّاق کا جُز دل نہیں
تُو نے فرمایا تو ہم مکّہ کی جانب ہیں رواں
جُز ترے ورنہ ہماری کوئی بھی منزل نہیں



ہم کو دُور کاریں نہ در سے، ہم ہیں مشتاقِ حضور
آپؐ نے جو درد بخشا، اُس سے دِل ہے ناصبُور
کیجئے ہم سے طلب سب کچھ تحمّل کے سوا
آپؐ کے عشّاق ہیں صبر و سکوں سے دُور دُور



مَیں نے افرنگی بُتوں پر کر دیا دل کو فدا
اور تابِ اہلِ بُت خانہ ہی سے پگھلا گیا
اِس قدر بیگانہ اپنی ذات سے بھی میں رہا
خود کو دیکھا اور پہچانا نہیں، واحسرتا!



مَیں نے مغرب میں جو پی جا کر مئے غفلت اثر
ہے قسم میری کہ ہر قطرہ تھا اُس کا دردِ سر
بزمِ خوبانِ فرنگی میں بھی بیٹھا جب کبھی
کوئی دن دیکھا نہیں اُس روز سے بے سوز تر!



مَیں ترے در کا گدا ہوں اور تجھی سے داد خواہ
ہو کرم تو کوہ کو کر لوں اسیرِ برگِ کاہ
بن گیا میرے لئے درسِ حکیماں دردِ سر
کیونکہ مَیں تو ہوں ترا پروردۂ فیضِ نگاہ!



صوفی و مُلّا کا مَیں ہوتا نہیں ہوں ہم نشیں
جانتا ہے تُو کہ مَیں یہ بھی نہیں وُہ بھی نہیں
حرفِ "الا اللہ" لکھ دے تُو جو میرے قلب پر
خود کو اور اللہ کو دیکھوں گا با نُورِ یقیں!



سینۂ مُلّا میں دل ہے، دل میں لیکن غم نہیں
چشم میں نُورِ نظر ہے، لیکن اُس میں نم نہیں
مکتبِ مُلّا سے مَیں ہر دم گریزاں ہی رہا
کیونکہ اُس کی ریگِ صحرا میں کوئی زمزم نہیں



گرچہ ہے صدہا کتابوں سے بھری اُس کی کنار[1]
وعظِ مُلّا بر سرِ منبر ہے یکسر نیشدار
مَیں نے خجلت[2] سے نہیں کچھ بھی کہا تیرے حضور
خود سے وہ پنہاں رہا اور ہم پہ دائم آشکار!

[1] کنار : آغوش۔ [2] خجلت : شرمندگی۔



قلبِ صاحب دل کو اُس نے، یا کیا مَیں نے اسیر؟
مَیں کہ وہ لایا پیامِ اُلفتِ ربِّ قدیر؟
گرچہ مُلّا اور مَیں دو تیر ہیں از کیشِ[1] دیں
تُو ہی فرما کس کا بیٹھا ہے ہدف پر جا کے تیر؟



مَیں تو اپنی بزم میں بھی ہوں غریب و بے نوا
درد و غم اپنا کہوں کس سے، ذرا تُو ہی بتا؟
خوف کھاتا ہوں کہ ہو جائے نہ رازِ عشق فاش
اپنے دِل سے بھی نہیں کہتا مَیں اپنا ماجرا

[1] کیش : ترکش۔

○

دِل نہ اپنا غیرِ حق میں نے کسی کو بھی دیا
بن گئی میری دُعا ہی خود مری مشکل کُشا
جُز خُدا تکیہ کیا مخلوق پر جب ایک بار
راہ میں دو سو جگہ میں ضعف سے گرتا رہا

○

سر میں میرے موجزن ہے اب بھی تیرا ہی جنوں
تُو نے جو ہنگامے بخشے، ہیں ابھی وہ رہنموں
جوشِ طوفاں جو کبھی ماضی میں حاصل تھا ہمیں
آج بھی میرے گھر[1] میں اُس سے ہے جوشِ دروں

[1] گھر: مراد دل۔



خاک ہوں لیکن ابھی تک ہوں میں دارائے شرر[1]
آج بھی رقصاں ہے سینے میں مرے آہِ سحر
میری آنکھوں پر تجلّی ڈال تا معلوم ہو
ہے بڑھاپے پر بھی میری چشم میں تابِ نظر



ہر دو عالم سے نظر رہتی ہے میری بے نیاز
ہو رہا ہے قلب میرا سوزِ باطن سے گداز
عصرِ بے اخلاص ایسا، اور یہاں میری نمود!
تُو ہی فرما اِس عمل میں کونسا پنہاں ہے راز؟

[1] دارا: بمعنی دارندہ۔ رکھنے والا



سوز سے محروم دُنیا میں مجھے پیدا کیا
جانِ محشر آفریں کی جسم کو میرے عطا
بن رہی ہے زندگی گردن میں میری اک کمند
دار کے تختے پہ گویا ہوں مقیّد ہو رہا



لالہ ہو گُل ہو، نہیں لیتے وہ میرے رنگ و بُو
مُردہ ہو کر رہ گئی سینے میں میری آرزو
چھپ نہیں سکتا غمِ پنہاں مرا الفاظ میں
اور اگر چھپ جائے بھی کس سے کروں میں گفتگو؟



مشرق و مغرب میں رہتا ہوں میں تنہا و غریب
دوستانِ رازداں سے بھی ہوں ہم بے نصیب
رنج و غم اپنا سنا لیتا ہوں اپنے قلب کو
سادگی سے اس طرح دیتا ہوں غربت کو فریب



میں نے ہی توڑا طلسمِ علمِ حاضر کا نظام
دانہ دانہ چُن لیا، اور پھونک ڈالا دام دام[1]
ہے خدا شاہد کہ اس کی آگ میں مثلِ خلیلؑ
پوری بے باکی سے میرے دل نے رکھا ہے قیام

[1] دام دام: یعنی پورا کا پورا جال



تُو نے ہی بخشا ہے میری چشم کو نُورِ نگاہ
نُور نے تیرے دیا ہے دل کو نُورِ لَا اِلٰہ
پھر کرا دیدارِ صبحِ "مَنْ[1] رَآنِیْ" کا مجھے
پھر عطا فرما شبِ تیرہ کو میری تابِ ماہ!



جب کیا حق نے مجھے فطرت کا میری رازداں
نُور سے تیرے مری عظمت ہوئی مجھ پر عیاں
دیرِ عالم میں ہے یہ فیضِ نوائے صبحگاہ
مَیں نے جس سے ہے بنایا عشق و مستی کا جہاں

[1] حدیث مَنْ رَآنِیْ فَقَدْ رَآ اللہ یعنی جس نے مجھے دیکھا اُس نے اللہ کو دیکھ لیا۔



ہے اسی دُنیا میں پیدا اک بہشتِ خوش گوار
تازہ میرے اشک سے رہتی ہے جس کی شاخسار
اُس کی قسمت میں نہیں لیکن ابھی وہ ہاؤ ہو
کیونکہ اُس کو ہے ہنوز اک مردِ حق کا انتظار



کر عطا اُمّت کو اپنی وہ جوانِ پاکباز
جس کی مستی کا ہو سرچشمہ شرابِ خانہ ساز
اُس کا بازو ہو قوی حیدرؓ کے بازو کی طرح
اور دل بھی اُس کا ہو دونوں جہاں سے بے نیاز



بزم میں آ، اور لا گردش میں ساقی جامِ مے
اور اس مے سے تُو پھر سوزندہ تر کر سوزِ نَے
میرے سینے میں عطا فرما وہ دل پھر ایک بار
جس کی قوّت سے میں توڑوں پنجۂ کاؤسؔ و کَے



عشق ہے بنیادِ عالم، جو ترے سینے سے ہے
عشق کی مستی تری صہبائے دیرینہ سے ہے
نُوریوں میں سب سے برتر ہے مقامِ جبرئیلؑ
اُس کا جوہر بھی ترے ہی نورِ آئینہ سے ہے

۵ کاؤس : نام بادشاہ کا جسے کیکاؤس بھی کہتے ہیں ۔ کَے : مخفف کیخسرو کا جو ایک بادشاہ عجم تھا



سوزِ دل میرا سراسر تیرے فیضِ دم سے ہے
اور میرے تاک[1] میں صہبا تری زمزم سے ہے
مُلکِ جم بھی میری درویشی سے نادم ہو گیا
کیونکہ دِل محرم ہے تیرا، اور تیرے غم سے ہے!



دیرِ عالم میں کسی سے دِل نہ وابستہ کیا
پھر بھی مَیں اپنے مقامِ خاص سے نیچے رہا
چاہتا ہے آج وہ باطل خُدا مجھ سے سجود
کل جسے میرے ہی ہاتھوں نے کیا محو و فنا

[1] تاک : انگور کی بیل۔



میری مشتِ خاک ہے اُس لالہ کی پروردگار
جس کو خُونِ ناب دیتا ہے مرا ہی قلبِ زار
ایسے دِل کو رد نہ کر، کہتے ہیں تجھ کو دِل نواز
ایک دِل ہی ہے مرے پاس اے شہِ والا تبار!



بزمِ ملّت میں رہا ہوں مَیں سراپا اضطراب
اور نواؤں نے مری ہر قلب کو بخشا شباب
ہے تقاضائے ادب کر دے سخن کو مختصر
کچھ تو تڑپا، کچھ سُنایا اور ہُوا پھر مستِ خواب!



یا نبیؐ! میرے ہی صدقِ فطرتِ رندانہ سے
اور سازِ نالہ، سوزِ آہِ بے تابانہ سے
بھیج خاکِ مردۂ مسلم پہ پھر ابرِ بہار
تا بھرے آغوش اپنی میرے ہر ہر دانہ سے



دل بہ کف پھرتا ہوں میں، لیکن کوئی دلبر نہیں
ساز و ساماں رکھ دیا صحرا میں، غارت گر نہیں
آ کرم کر، اب مرے ہی قلب کو مسکن بنا
دہر میں کوئی ہی مسلم مجھ سے تنہا تر نہیں!



مثلِ رومیؔ مَیں نے دی جا کر حرم میں بھی اذاں
اور اُسی کے عشق نے سکھلائے سب اسرارِ جاں
محو اُس نے کر دیا تھا فتنۂ عصرِ کہن
اور مٹا یا آ کے مَیں نے فتنۂ عصرِ رواں!



خاک سے میری تُو فطرت کے حسیں گلشن اُگا
اور مرے اشکِ مسلسل خُونِ لالہ میں مِلا
مَیں اگر تیغِ علیؓ کی شان کے لائق نہیں
تیزیٔ شمشیرِ حیدرؓ ہی نظر کو کر عطا



ساحلِ دریا پہ مُسلم جب سے ہے راحت پذیر
ہے خجل دریا سے اور خود یاس و حسرت میں اسیر
کوئی کیا جانے کہ باطن اُس کا ہے کتنا فگار
دیکھتا ہے زخم اُس کے صرف یہ مردِ فقیر!



کِس نے مسلم کو دیا مژدہ کہ آئی بوئے یار؟
کس نے رکھّی اُس کے سینے میں امیدِ نوبہار؟
مٹ چکا تھا اِس کے دم سے جبکہ وہ سوزِ کہن
کِس نے پھینکا نیستاں میں اُس کے اِک تازہ شرار؟



میری ندّی میں بھی بھیج اپنے سمندر سے گہر
میرے فیضِ رُوح سے معمور کر دے دشت و در
تُو نے جو طوفاں دیا، اُس سے نہیں دل کی کشود
کر بپا سینے میں میرے شورِ طوفانِ دگر!



دیکھ میں جلوت[1] میں ہوں کس جوشِ دل سے نے نواز
دیکھ میں خلوت میں ہوں کس سوزِ جاں سے خود گداز
جب سے نکتہ فقر کا سمجھا گئے مجھ کو بزرگ
دیکھ! شاہوں سے بھی پاتا ہوں میں خود کو بے نیاز

لہ جلوت : محفل ، بزم



مَیں رہا جس حال میں سرشارِ نغمہ ہی رہا
چاک ہر پردے کو مَیں نے روئے معنی سے کیا
دوست کی اُلفت میں تُو مت پوچھ میرا اضطراب
ایک دم تھا پاس اُس کے دُوسرے دم تھا جُدا



میں رہا دائم شریکِ سوز و سازِ لالہ زار
اور کر ڈالا ضمیرِ زندگی کو آشکار
نکتہ ہائے شوق کیا معلوم کس کس نے سُنے
میں تو تنہائی میں تنہا ہی رہا ہوں نغمہ بار



نُور سے تیرے کیا کرتا ہوں مَیں روشن نگاہ
تاکہ دیکھوں اِس نگہ سے اندرونِ مہر و ماہ
جب یہ کہتا ہوں کہ "مسلم ہوں" لرز جاتا ہے دِل
کیونکہ مَیں ہی جانتا ہوں مشکلاتِ لَا اِلٰہ



تیرے کوچے میں مجھے بس ہے گدازِ یک نوا
اور کافی ہے مجھے یہ ابتدا، یہ انتہا!
مَیں تو ایسے رند کی جرأت سے ہوں مست و خراب
جس نے حق سے کہہ دیا "کافی ہے مجھ کو مصطفیٰ!"



شوق سے تیرے ہی سیکھا ہیں نے شورِ ہاؤ ہو
جو کہ پتھر سے رواں اک دم میں کر دے آب جُو
ہے یہی اک آرزو تجھ سے کہ جاویدِ عزیز
عشق سے تیرے ہی پائے زندگی میں رنگ و بُو



اک نظر دیکھے اگر تُو یہ فرنگی کج کلاہ
تُو کہے گا خاک پر نازل ہوئے ہیں مہر و ماہ
گرم خوں ہے میری ملّت کا جوانِ سادہ لوح
تُو ہی دے اِن کافروں کے عشق سے اُس کو پناہ!



گر رہے ہیں جو، اُنھیں دے ہاتھ تو امداد کا
گو وہ عاصی ہیں مگر اللہ سے ہیں باوفا
ایسی آتش سے، کہ جس سے جاں مری روشن ہوئی
ایک حصہ کر مسلمانانِ عالم کو عطا!



تو بھی ہو محبوبؐ کی مینائے مے سے بہرہ ور
تا رہے تو محفلِ محبوب میں شام و سحر
کون "سجدہ" اِس کو کہہ سکتا ہے اے عبدالعزیز[1]؟
صاف میں مژگاں سے کرتا ہوں نبیؐ کی خاکِ در!

[1] سلطان ابن سعود



تُو ہے سلطانِ عرب اور مَیں ہوں اک ادنیٰ فقیر
اِس فقیری پر بھی ہوں اقلیمِ معنی کا امیر!
جس جہانِ نُور کا خالق ہے تخمِ لَا اِلٰہ
دیکھا ہے معمور اُس سے میری آغوشِ ضمیر!



گو سراپا درد ہوں، اور دردِ درماں ناپذیر
مت سمجھ لیکن کہ ہوں مَیں ناتوان و زار و پیر
ایسی حالت میں بھی ہو سکتا ہوں مَیں زیبِ کماں
برق رَو ہوں، ترکشِ ملّت سے ہوں افتادہ تیر!



آ کہ باہم مل کے اے ہمدم کریں رقصِ جنوں
آ کہ دل سے محو کر دیں الفتِ دنیائے دوں
آ، خدارا آ کہ ناچیں کوچۂ محبوب میں
اور گرائیں آستاں پر اُس کے پیہم اشکِ خوں



تُو نے اے حاجی کیا ہے اس بیاباں میں قیام
شام بھی جس کی ہے مانندِ سحر آئینہ فام
جس جگہ چاہے لگا لے خیمہ دشتِ یار میں
ہے طنابِ غیر کی لیکن طلب اس جا حرام!



مَیں ہوں مُسلم، دِل مرا رہتا ہے آزادِ مکاں
توڑ دیتا ہوں مَیں دم میں حلقۂ نُہ آسماں
سجدۂ توحید مجھ کو حق نے سکھلایا ہے وُہ
ہیچ ہے جس کے مقابل ہر خداوندِ جہاں!



تُو فرنگی بُت کے قدموں پر نہ رکھ اپنی جبیں
قیمت اُس کے عہد کی اک جَو برابر بھی نہیں
چشمِ فاروقی سے لے نُورِ نگاہِ پُرجلال
پھر قدم بے باک رکھ دُنیا میں با عزم و یقیں!

حضورِ ملّت

کر نہ تُو مجھ سے طلب ہرگز کلامِ عارفاں
کیونکہ میں رکھتا ہوں فطرت میں سرشتِ عاشقاں
اشکِ لالہ گوں سے میرے تازہ ہے ملّت کا باغ
ہے مری شبنم کا ہر دانہ یہاں قطرہ فشاں

حضورِ ملّت

بحق دل بند و راہِ مصطفےٰ رو

مثلِ ماہِ تو لگا تو اپنی منزل کا پتا

اور اس نیلی فضا میں اپنی ہستی کو بڑھا

دہرِ عالم میں اگر مطلوب ہے اپنا مقام

دل لگا لے حق سے ، رہ پابندِ راہِ مصطفےٰ!!



موج کی مانند اپنے بحر ہی سے ہوں عیاں
خودی میں پیچیدہ گوہر کی طرح ہے میری جاں
میں نے کی ہے مثلِ ابراہیمؑ تعمیرِ حرم
اس لئے رہتا ہے ہر نمرود مجھ سے سرگراں



آ بھی ساقی اور لا گردش میں اپنا ساتگیں[1]
ہر دو عالم تیری صہبا کے مقابل کچھ نہیں
رند پر تُو نے کیا ہے فاش رازِ زندگی
کیونکہ مُلّا اور مُفتی نے نہ سمجھی رمزِ دیں!

[1] ساتگیں : جام



آ بھی ساقی اور اُٹھا رخسار سے اپنے نقاب
اب تو میری چشم سے گرتا ہے دل کا خونِ ناب
ایسی لَے میں، مشرق و مغرب میں جو ناپید ہو
"لاتخف"[1] کے مقصد و معنی کو کر دے بے حجاب!



قیدِ سینہ سے رہا کر دے ذرا تکبیرِ خود
آزما اب خاک پر اپنی ہی تو اکسیرِ خود
کر خودی محکم، مسرّت سے بسر کر زندگی
مت کسی کے ہاتھ میں نادان دے تقدیرِ خود!

[1] لاتخف: خوف مت کھا۔



ہے خودی ہی سے مسلماں دہر میں مردِ تمام
خاک میں اُس کی خُودی مُردہ ہے جب تک ہے غلام!
فی الحقیقت خود کو گر سمجھو تم اپنی ہی متاع
غیر پر کرنا نظر اپنے سوا سمجھو حرام!



جن مسلمانوں نے اپنا آپ دیکھا فاش تر
پا گئے راحت وہ ہر دریا میں مانندِ گہر
عظمتِ باطن سے جب کرنے لگے غافل گریز
اپنے ہاتھوں ہی سے کاٹا اپنی ہستی کا شجر!



چہرۂ تقدیر سے پردہ دیا ہیں نے اٹھا
ہو نہ اب مایوس اور لے اٹھ کے راہِ مصطفےٰ
گر تجھے آتا نہیں میری نصیحت پہ یقیں
دین سے پہلو تہی کر، کافروں کی موت پا!



کر دیا ترکوں پہ حق نے بند دروازوں کو وا
مصریوں کی بھی بنائے کار کو محکم کیا
تو بھی دامانِ خودی کو تھام دستِ شوق سے
بن خودی کے ملک و دیں کرتا نہیں خالق عطا



ہو خزاں آمادہ اک ملّت کی جب شانِ بہار
بُو بھی اُس کے پھُول کی کرتی ہے پھر اُس سے فرار
گرچہ اُس کی خاک سے اُگتے ہیں پیہم لالہ زار
اُڑ رہا ہے ہر گھڑی اُن کا بھی رنگِ خوشگوار[۱]



ایسی ملّت کو عطا اللہ نے کی سروری
جس کی قسمت بھی لکھی تو ہاتھ سے اپنے لکھی
لیکن اُس ملّت کے حق میں ہے خُدا بھی سرد مہر
جس نے بوئی کشتِ غیراں اور نہ مزدوری ملی[۲]

۱؎ مراد ملّتِ سرمایہ داراں ؎ ۲؎ مراد ملّتِ مزدوراں ؎



معنیٔ قرآں میں رازی سے روشن کر دماغ
شمعِ حکمت سے اُسی کی تُو جلا اپنا چراغ
باوجود اس کے مرا بھی ایک نکتہ یاد رکھ
زندگی بھی موت ہے بے اضطراب و سوز و داغ!



جو خودی میں کر لے پیدا سوز و سازِ لآ الٰہ
خاکِ مُردہ سے بھی وُہ پیدا کرے گا اک نگاہ
مرد جب ایسا ملے، دامن نہ اُس کا چھوڑ تُو
کیونکہ اُس کے دام میں دیکھے ہیں میں نے مہر و ماہ



اپنی مشتِ خاک میں ناداں دِلِ آگاہ ڈھونڈ
خود ہی میں مشلِ بزرگاں آپ اپنی راہ ڈھونڈ
کس طرح مومن کیا کرتا ہے تخفی کو بھی فاش
بحرِ اِلّا اللہ میں ہو غرق اُس کی تھاہ ڈھونڈ!



دِل تو ہے سینے میں تیرے ہے مگر محروم داغ
اِس نے پایا ہی نہیں ایمان کا کوئی سُراغ
تُو نے گلزارِ خودی کو آج تک پانی دیا
ایسے دریا سے کہ ہے طوفان سے جس کو فراغ

انا الحق

کچھ نہیں رمزِ انا الحق جز مقامِ کبریا
وصل ہے اس کی جزا؟ یا دار ہے اُس کی سزا؟
فرد جب کہہ دے "انا الحق" سرزنش اُس کو کرو
قوم جب کہہ دے انا الحق، پھر نہیں یہ ناروا



صرف اُس ملّت کو ہوتا ہے انا الحق سازگار
خون سے جس کے تر و تازہ ہے اُس کی شاخسار
ہے جمال اُس کا حقیقت میں جلالِ بے پناہ
کیونکہ ہیں تو چرخ اُس کے نور کے آئینہ دار



ہے صفِ اقوامِ عالم میں بہت والا مقام
کیونکہ اُمّت ہے محمدؐ کی دو گیتی کی امام
آفرینش[1] کے عمل سے وہ نہیں تھکتا کبھی
خستگی اور خواب ہے اللہ پر یکسر حرام



شعلہ کر دیتا ہے اُس کے جسم کو سوزِ دروں
خار و خس اُس کی نظر میں ہے جہانِ چند و چوں
مردِ مومن ہی اُٹھاتا ہے "انا الحق" سے حجاب
اُس کے ہر کُن[2] کا نتیجہ پا نہیں سکتا "یکون"[3]

[1] آفرینش : پیدائش ۔ [2] کُن : ہو جا ۔ [3] یکون : بس وہ ہو گیا

○

چرخ پر پرواز مومن کی یگانہ ہی رہی
اور نظر بھی اُس کی سوئے آشیانہ ہی رہی
ماہ و انجم کو رکھا اُس نے گرفتارِ کمند
ہاتھ میں مومن کے تقدیرِ زمانہ ہی رہی

○

باغ میں مومن ہے گویا عندلیبِ خوش صفیر
راغ[1] میں لیکن ہے وہ مانندِ شاہیں زودگیر[2]
پادشاہی میں بھی قائد اُس کا رہتا ہے فقیر
اور اُس کا فقر درویشی میں ہے رشکِ امیر

[1] راغ : جنگل   [2] زودگیر : جلد پکڑنے والا

○

جامِ نَو میں ڈال دے کہنہ شرابِ مُشک بُو
نُور سے اپنے منوّر کر دے پھر یہ کاخ و کُو!
چاہتا ہے گر ثمر تُو شاخ سے منصورؒ کی
دِل میں اپنے منقش کر لے معنیٰ "اللہ ھُو!"

صُوفی و مُلّا

تلخ گوئی سے ہے مُلّا کی سبھی کا دل گداز
پوست کا وہ مغز سے کرتا نہیں کچھ امتیاز
یہ تو سب کچھ ٹھیک ہے جیسا گر مومن ہوں میں
مجھ کو کعبہ سے اُٹھا دینے کا ہے مُلّا مجاز!



کعبہ و بُت خانہ بھی صیدِ فرنگی ہوگیا
ذکرِ حق کی خانقاہوں سے نہیں اُٹھتی صدا
جب شکایت پیشِ مُلّا کی، لگا کرنے دُعا
یا الٰہی! خاتمہ بالخیر ہو اِس شخص کا!



تُو نہ ہرگز ہو سکا قرآں سے حکمت پذیر
صوفی و مُلّا کے پھندوں میں رہا دائم اسیر
تجھ کو یہ مطلب ہے بس قرآں کی آیات سے
جب پڑھے "یٰسین" تو آساں مریں برنا و پیر



دیکھ اپنے خال و خد، قرآں کو آئینہ بنا
ہو چکا ہے مسخ تُو، اپنے سے فوراً دور جا
لے ترازو عشق کا، تول اُس میں پھر اپنے عمل
جو صحابہؓ نے اُٹھائے، تُو بھی وہ محشر اُٹھا



صُوفی و مُلّا کو میں آداب لاتا ہوں بجا
کیونکہ دونوں نے پیامِ اللہ ہم کو دیا
الاماں! اِن کی مگر آیات کی تاویل سے
محوِ حیرت ہیں خدا اور جبرئیل و مصطفےٰ

○

حرفِ دوزخ ہیں سناتے واعظینِ کفرگر
بات کافر نے کہی ہے اُن سے بھی اک خوب تر
جس نے دوزخ کو بتایا کافروں ہی کا مقام
وہ غلام اپنی ہی فطرت سے ہے اب تک بے خبر!

○

ایک محفل میں مریدِ خود شناس و پختہ کار
پیر سے کہنے لگا یہ حرفِ تیز و نیش دار
آپ پہ طاری ہر گھڑی رہتی ہے مرگِ ناتمام
جو بزرگوں کی بھی پیچھے بیٹھ کر کھا گئے مزار!

○

ایک دِن کہنے لگا بیٹے سے اک مردِ اصیل
سُن یہ نکتہ اور بنا ہستی کی تُو اِس کو دلیل[1]

عصرِ حاضر کے جو ہیں نمرود، اُن سے مِل مِلا
فیض سے اُن کے ادا کر پائے گا فرضِ خلیلؑ!

رومیؔ

پی لے پھر مے خانۂ رومیؔ سے وہ کہنہ شراب
سامنے اِس جام کے ہے ملکِ جم بھی اک حباب

پھر حریمِ قلب کو اشعارِ رومیؔ سے سجا
اور پیدا کر تنِ مردہ میں پھر رُوحِ شباب!

سلہ دلیل: بمعنی راہنما



ساغرِ رُومی سے پی لے پھر شرابِ لالہ رنگ
اِس کے اعجاز و اثر سے لعل ہو جاتا ہے سنگ
یہ ہرن کو بھی عطا کرتی ہے شیروں کا جگر
اور دھو دیتی ہے یکسر داغ سے پشتِ پلنگ



اُس کے سوز و ساز سے میں نے بھی اک حصّہ لیا
میری شب نے اُس کے کوکب ہی سے پائی ہے ضیا
دیکھ صحرائے حرم میں تو ذرا حالِ غزال
اُس کے ہونٹوں سے ہُوا گلریز خندہ شیر کا



خود ہی رُومی دردِ سوزِ آشنائی ہو گیا

وصل بھی اُس کا زباں دانِ جُدائی ہو گیا

فیض پایا اُس کی نَے سے جب جمالِ عشق نے

وہ سراپا اک جلالِ کبریائی ہو گیا



مجھ سے ناکارہ کے عقدوں کو کیا ہے اُس نے وا

اور کر ڈالا غبارِ رہ گزر کو کیمیا!

ایک رومی ہے وہ مردِ نے نواز و پاکباز

عشق و مستی سے کیا ہے جس نے مجھ کو آشنا



دستِ رومی نے کیا ہے دِل کے دروازے کو باز
خاک سے میری ہُوا پیدا جہانِ سوز و ساز
فیض سے اُس کے مجھے حاصل ہُوا ہے یہ مقام
انجم و خورشید و مہ کے ساتھ پڑھتا ہوں نماز!



ہے خیال اُس کا مہ و انجم سے دائم ہم نشیں
ماورا پیروین سے ہے اُس کی نگاہِ دُوربیں
سامنے رُومی کے تُو اپنا دلِ بے تاب رکھ
وہ کرے دم جس پہ اُس سیماب میں رعشہ نہیں!



سیکھ درویشی سے رومی کی نوا اسرارِ فقیر
کیونکہ اُس کا فقر ہے محسودِ ہر میر و وزیر
الحذر، اُس فقر و رہبانی سے ہر دم الحذر
کر دیا جس نے تجھے طوقِ غلامی میں اسیر!



ہو گئی جب سے خودی انساں کی مہجورِ خدا
فقر کو اُس نے سکھا ڈالے ہیں آدابِ گدا
میں نے رومی ہی کی چشمِ مست سے حاصل کیا
جو زبانِ دل میں ہے سوز و سرورِ کبریا



تاک سے میرے مئے روشن سدا گرتی رہی
مردِ خوش قسمت ہے جس نے کی ہے میری پیروی
میں تو ایسی تیز و تند آتش سے رکھتا ہوں نصیب
جو سنائیؔ نے بپا آخر دلِ رومیؔ سے کی!

پیامِ فاروقؓ

تُو عرب کے دشت سے طوفاں بپا کر اے ہوا
مصریوں کے نیل سے پھر موجِ محشر زا اُٹھا
جا کے کہہ فاروق سے پیغام یہ فاروقؓ کا
ذات میں اپنی تُو شاہی اور فقیری کو ملا!



کیا ہے مفہومِ خلافت؟ فقر با تاج و سریر[1]!
سب سے بہتر ہے وہ دولت جو ہو پایاں ناپذیر[2]
اے جواں! اس فقر کو تو ہاتھ سے ہرگز نہ دے
جب نہ ہو یہ فقر تو ہے پادشاہی زود میر!



دیکھتا ہے فاش اپنے کو جب اک مردِ جواں
از سرِ نو ہے بناتا توڑ کر کہنہ جہاں
جب وہ ہو جاتا ہے اپنے آپ میں خلوت گزیں
انجمن ہر دم نئی گرد اُس کے ہوتی ہے عیاں!

[1] سریر: تخت۔ [2] پایاں ناپذیر: ختم نہ ہونے والی

○

عقل و دل پر کھول دے ہر حکمتِ عالم کا در
لے تو ہر پیرِ مغاں سے ساغرِ دانش اثر
چشم میں سینے سے لا اتنے اُٹھا کر تُو گُہر
پاک ہو دامن[1] ترا اور آستیں[2] تیری ہو تر!

○

خوب ہے وہ قوم جس نے پا لیا اپنا مقام
اور دردِ جستجو سے جس پہ راحت ہے حرام
یوں مجلّٰی ہے وہ ملت زیرِ چرخِ نیلگوں
جیسے رخشاں ہو شعاعِ خُور میں تیغِ بے نیام

۱؎ پاکدامن ہونا محاورہ ہے بے گناہ ہونے کے مفہوم میں ۲؎ آستیں تر: یعنی خدا کے حضور اشکِ ندامت سے



کیف میں اک ناخدائے ترک تھا محوِ سرود
رُخ تھا اُس کا لالہ گوں اور چشم تھی اُس کی کبود
گر کبھی دریا میں عقدہ آپڑے کوئی مجھے
مَیں تو چاہوں گا فقط طوفان سے اُس کی کشود!



ہے ازل ہی سے جہانگیری کی حامل میری خاک
اور امامت کی امیں ہے یہ جبینِ تابناک
دیکھ تُو سینے میں اپنے وہ جہانِ پُرشکوہ
تھا دلِ فاروقؓ میں مستور جس کا تخمِ پاک!



نُورِ دل سے پا لئے جس نے بھی اسرارِ یقیں
آخرش یک بیں ہوئی اُس مرد کی چشمِ دو بیں
جس طرح ملتی ہے باہم دو چراغوں کی ضیا
اِس طرح مربوط سمجھو تم نظامِ ملک و دیں!



جس مسلماں نے کیا اپنا ہی پیہم امتحاں
وہ بنا دے گا غبارِ راہ کو بھی آسماں
ہے شرارِ عشق گر دل میں ترے، محفوظ رکھ!
یہ شرر بن جائے گا اک آفتابِ ضو فشاں

شعرائے عرب

دو مرا پیغام جا کر، اے نوا خوانِ عرب!
نزد میرے ہیچ و بے قیمت ہے تیرا لعلِ لب
نورِ قرآں نے دیا جب سے مرے دِل کو فروغ
صبح میں بدلی ہے میں نے ہی صد و سی سالہ شب!



میں نے ہی برپا کیا رُوحوں میں شورِ ہائے و ہو
میں نے مشتِ خاک سمجھے ہیں جہاں کے کاخ و کُو
اک نہ اک دِن بحر کی ہو کر رہے گی وُہ حریف
میرے ہنگاموں سے ہے معمور جو بھی آب جُو!



حُسنِ معنی پر نظر کر، بن نہ تُو صورت نگار

صرف اپنے قلب ہی کو جان اپنا یارِ غار

گلشنِ ملّت میں جب تُو نے نکالے بال و پر

سوز و سازِ نغمہ سے مسلم کے دل کو بھی اُبھار!



ہے ہماری خاک میں دل اور دل میں غم بھی ہے

گو ہے شاخِ باغ کہنہ، لیکن اس میں نم بھی ہے

اب تو اعجازِ ہُنر سے اُس کا منبع کھول دے

سینۂ مسلم میں پنہاں چشمۂ زمزم بھی ہے!



ہے مسلماں درحقیقت بندۂ مولا صفات
دل میں اُس کے منکشف ہیں ہر گھڑی اسرارِ ذات
غیرِ نورِ حق نہ دیکھے گا تُو مومن کا جمال
کیونکہ اِس کا حُسن ہے رُوحِ روانِ کائنات!



خاکِ مسلم کو عطا فرمادے پھر وہ سوز و تاب
تاکہ اُس کی ظلمتِ شب سے ہو پیدا آفتاب
سینۂ پُر جوش سے اپنے بپا کر وُہ نوا
قلبِ مومن میں ہو پیدا جس سے ذوقِ انقلاب



ہے مسلمانی خرید دردوسوزِ قلب وجاں
اور غمِ یاراں ہیں رہنا پارے کی صورت تپاں
بھول جانا انفرادی زندگی کو پیشِ قوم
اور "انا الملّت"[1] کی دینا ہر دو عالم میں اذاں!



پالیے ہیں زندگی میں جس نے بھی اسرارِ جاں
دیکھتا ہے چشم سے اپنی ہی وہ رُوحِ جہاں
کر بپا سینے سے اب وہ نغمۂ جاں آفریں
جو خزاں کو بھی بناتا ہے بہارِ جاوداں!

[1] "انا الملّت": میں ایک قوم ہوں۔



جوہرِ ایماں ہے تن میں حفظ کے قابل ترا
ہے سرورِ سوز و مستی دہر میں حاصل ترا
مَیں نے دیکھے بزمِ عالم میں تہی سب کے سبو
ہے مئے باقی سے روشن صرف جامِ دل ترا



چھا رہی ہے جو شبِ کہسار و دشتِ سینہ تاب
اس میں کوئی مُرغ پیدا ہے نہ ہے اک موجِ آب
یہ کبھی روشن نہ ہو گی پرتوِ قندیل سے
چاہیئے ایسی شبِ تیرہ کو نُورِ آفتاب!



غور سے پڑھ لے تُو اے غافل خطِ سیما[1] ئے خود
ہاتھ میں پھر تھام لے فوراً رگِ فردائے خود
تُو بھی اب میری طرح دشتِ حرم میں رکھ قدم
تاکہ ہر ذرّے میں اُس کے دیکھ لے پہنا[2] ئے خود!



صبحدم جب دشت و در پر چھا گیا نُورِ جمیل
دے رہا تھا یہ صدا اک طائرِ شاخِ نخیل
چھوڑ کر خیمے کو اے فرزندِ صحرا کر سفر
زندگی ممکن نہیں دُنیا میں بے ذوقِ رحیل[3]

[1] سیما: پیشانی۔ [2] پہنا: وسعت۔ [3] رحیل: کوچ



کر دیا حق نے عرب کو رہنمائے کارواں
کیونکہ اُس نے 'فقر' سے اپنے کئے ہیں امتحاں
ہو اگر فقرِ تہی دستاں بھی خوددار و غیور
وہ تہ و بالا کریں اک لمحہ میں سارا جہاں



ایسی شب سے بھی خروشِ صبحِ فردا ہے بپا
طورِ سینا کی تجلّی سے جو پاتی ہے ضیا
جسم و جاں ہیں فرد کے محکم ہوائے دشت سے
کیونکہ قوموں کا جنم ہی کوہ و صحرا سے ہُوا

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اے مسلماں! اسے سیکھ پھر آئینِ تسلیم و رضا
اور عمل میں لا طریقِ صدق و اخلاص و وفا
کہہ نہ ہرگز شعر ایسا ہے ترا، ویسا نہیں
وہ جنوں دیتا ہوں تجھ کو جو کہ ہے حکمت فزا



جو جنوں ہنگامہ محفل سے بیگانہ ہوا
اُس جنوں سے ہر چمن دنیا کا ویرانہ ہوا
وحشتِ عالم میں برپا کی ہیں تو نے جو آوازِ ھُو
آخرش مجنوں بھی اُس سے مردِ فرزانہ ہوا



اِس چمن میں ہوں مَیں پہلا لالۂ صبحِ بہار
سوز دیتا ہے دمادم مجھ کو قلبِ داغدار
میری تنہائی کو اے نادان نفرت سے نہ دیکھ
روزِ اوّل سے ہوں میں صد کاروانِ گل درکنار!



مَیں پریشاں ہی رہا مانندِ گردِ رہگذار
تا ہوا کے دوش پر ہو جا گزیں میرا غبار
کس قدر ہے خرّم و خوش بخت ایسا روزگار
جس میں میری گرد سے پیدا ہو مردِ شہسوار!



ہے بہت خوش بخت وہ قومِ پریشاں روزگار
قلب سے جس کے ہو پیدا ایک مردِ پختہ کار!
ہے رموزِ غیب سے اک رمز ہی اُس کا وجود
کیونکہ ہر اک گرد سے ظاہر نہیں ہوتا سوار!



بحر میں اپنے مَیں مضطر موج کی صورت رہا
اِس کشاکش نے مجھے قطرے سے طوفاں کر دیا
ہجر سے بہتر نہ پایا زندگی میں کوئی رنگ
مَیں نے خونِ قلب سے پیکر بنایا یار کا



پُر ہوئے اکثر نگاہِ یار سے خالی سبو
اُس کی صہبا سے بھرا رہتا ہے تاکِ[1] آرزو
بذل[2] اُس کا جب عطا کرتا ہے اک طوفانِ آب
بحر سے ٹکرانے کو اُٹھتی ہے موجِ آبِ جُو



مردِ مومن ہاتھ میں لے جب زمامِ کارواں
روشنی کے ذوق سے ہوتا ہے ظاہر سرِ نہاں
فاش کرتا ہے وہ اہلِ چرخ کو اِس شان سے
اُس کے زیرِ پا بچھے رہتے ہیں ساتوں آسماں!

[1] تاک : انگور کی بیل۔ [2] بذل : سخاوت۔

○

سو مبارکباد کے قابل ہے وہ پاکیزہ جاں
بطن سے جس کے ہو پیدا وہ امیرِ کارواں
ایسی مادر کی تو ہے آغوش بھی اتنی حسیں
ایک ہی جلوے سے جس کے ہو خجل حورِ جناں!

○

سینے میں دِل کہہ رہا ہے قلب میں دلبر تو ہے
تُو کوئی ساماں لا، صحرا میں غارتگر تو ہے
یہ صدا آئی مرے کانوں میں ہمدم وقتِ موت
جب شگوفہ گر پڑے مٹی میں، وہ بھی بر[1] تو ہے!

[1] بر: پھل۔ اس شعر میں حیات بعد الممات کا اثبات کیا گیا ہے۔

خلافت و ملوکیّت

خود عرب نُورِ نبیؐ سے ہو گیا جب پُر ضیا
اُس نے مشرق کے چراغِ مردہ کو روشن کیا
ہو گئی گُم دہر سے لیکن خلافت کی وہ راہ
جس نے پہلے مومنوں کو درس شاہی تھا دیا



عظمتِ مومن پہ شاہد ہے خلافت کا نظام
'پادشاہی' دینِ فطرت میں ہوئی مطلق حرام
ہے ملوکیّت سراسر پیکرِ مکر و فریب
اور خلافت حُکم و ناموسِ الٰہی کا قیام!



پادشاہوں سے بھی ٹکراتا ہے گاہے اک کلیم
بے تفنگ و بے کلاہ و بے رفیق و بے گلیم!
یوں بھی ہوتا ہے کہ اکثر کھیل میں تقدیر کے
کام طوفانوں کا لے جاتی ہے اک موجِ نسیم!



ہے ابھی تک اس جہاں میں آدمی زادہ غلام
خام ہے اُس کا نظام اور کام اُس کا ناتمام
مَیں تو بندہ ہوں سراسر اُس نبیؐ کے فقر کا
دین میں جس کے ملوکیّت ہوئی مطلق حرام!



اُس نبیؐ ہی کی نگاہوں سے ہے اُلفت پائدار
جس کا مسلک ہو چکا ہے عشق و مستی کا عیار
ہے شریعت میں اگرچہ "عبدُہٗ" اس کا مقام
قلب اُس کا ہے جہانِ شوق کا پروردگار!

تُرکِ عُثمانی

گرچہ اپنے ملک میں ہے ترک خوش حال و امیر
قلب ہے آگاہ اُس کا چشم ہے اُس کی بصیر
مت سمجھ لیکن کہ ہے آزاد وہ افرنگ سے
ہے ابھی تک وہ فرنگی ہی کے جادو میں اسیر!



مرد ہے، جس نے کیا ہے سحر کو اُس کے فنا
اور دِلِ عہدِ فرنگی سے نہ وابستہ کیا
اپنی عظمت کو سمجھ، رحمت سے ہو مت نا امید
مرد تجھ سے بھی، ہیں بھی، اور موعود ہے اُن کی بقا!



ملّتِ ترکی نے پایا حق سے ایسا انقلاب
آرزوئے تازہ سے وُہ ہو چکی ہے فیضیاب
چشمِ مسلم! دیکھ اِس طوفان کی تہ میں ہے کیا
چہرۂ تقدیر سے فطرت نے اُلٹی ہے نقاب!

دُختران ملّت

چھوڑ اے دُختر تصنّع کا طریقِ دلبری
لائقِ مسلم نہیں ہے یہ نظامِ کافری
سُرخی و غازہ پوشیدہ ہو نہ اے عصمت کی رُوح
سیکھ اب اپنی نظر سے کفر کی غارت گری



تُو اگر سمجھے نظر تیری ہے شمشیرِ خُدا
زخم سے جس کے ہمیں حق زیست کا حاصل ہُوا
دل ترا جب پاک ہو تو دل ہمارا بھی ہو پاک
پس حیا سے تیغِ عصمت کو عطا کر دے جلا



عصرِ حاضر کا ضمیرِ پُر فتن ہے بے نقاب
اِس کی آرائش کا سامانِ جلا ہے رنگ و آب
نُورِ حق سے سیکھ اے دُختر جہاں تابی کا راز
چار سُو ہیں اُس سے روشن، خود ہے وہ زیرِ حجاب!



ہیں نظامِ دہر کی قوّت کا باعث اُمّہات
اُن کی ہستی سے نمایاں ہیں عمل کی ممکنات
قوم جو بھی عظمتِ نسواں سے ہوگی بے خبر
کاروبارِ زندگانی اُس کا ہوگا بے ثبات!



حق نے میری ماں کا روشن کر دیا تھا اندروں
دے گئی مجھ کو نظر سے یہ خرد پرور جنوں
قلبِ زندہ، چشمِ بینا کر نہ مکتب میں تلاش
مدرسے میں کچھ نہ پائے گا تو جز سحر و فسوں!



زندہ ہے وہ قوم جس میں زن کا دستورِ حیات
دین و آئیں کو عطا کرتا ہے اک رُوحِ ثبات
حال ہو ماضی ہو یا اندازِ استقبال ہو
سب کی کیفیت ہے منقوشِ جبینِ امہات!



بندۂ درویش کی اک پند اگر کر لے قبول
غیرِ فانی ہو گی تُو، ہرگز نہ ہو گا دِل ملول
عصرِ حاضر کی نگاہِ پُر ہوس سے دُور رہ
پائے تا شبیرؑ سا فرزند تُو مثلِ بتولؓ



کر ہماری شام سے تخلیق پھر نُورِ سحر
اِس طرح قرآن پڑھ، رونے لگیں اہلِ نظر
آہ اے ناداں تجھے معلوم کیا اپنا مقام
تیری قرأت نے بدل ڈالی تھی تقدیرِ[١] عمرؓ!

١ حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کی طرف اشارہ ہے۔

عصرِ حاضر

عصرِ حاضر کے عمل سے دیں ہُوا ہے نوحہ خواں
اِس کی آزادی میں بھی قید و غلامی ہے نہاں
نقشِ باطل جو بنایا ہے یہاں بہزاد نے
رنگ و بُوئے آدمیّت کا نہیں اُس میں نشاں!



ہے نگاہِ عصرِ حاضر نقشبندِ کافری
اور کمالِ صنعتِ موجود نقشِ آذری!
الحذر، اِس دور کے سوداگروں سے الحذر
اِک جُوا ہے درحقیقت اُن کی یہ سوداگری!



نوجوانوں کے لئے یہ عصرِ بد آموز ہے
جو شبِ ابلیس ہے اُس کا یہ گویا روز ہے
اس کے دامن میں مثالِ شعلہ میں پیچاں رہا
کیونکہ اِس کی آگ بھی بے نور ہے بے سوز ہے!



دستِ مسلم نے کئے ہیں فقر و سلطانی بہم
اُس کے دل میں ہو چکے ہیں باقی و فانی بہم
الاماں، اِس دَور کے مکر و فسوں سے الاماں
مل گئی ہے اِس میں سلطانی و شیطانی بہم

○

کونسی شے نے کیا رقصاں تجھے؟ مَیں کیا کہوں!
بھنگ ہے یہ، اور نہیں ہرگز نشاطِ اندروں
ہو رہا ہے تُو بہ تقلیدِ فرنگی پائے کوب
جسم میں ورنہ کہاں پہلا سا وہ طغیانِ خُوں

برہمن

تُو نے ورثوں کا اپنے آپ پہ خود وا کیا
دو قدم چلنے نہ پایا تھا کہ دھم سے گر پڑا
برہمن نے تو سجایا بُت سے اپنے طاق کو
تُو نے بھی قرآں لپیٹا طاق میں پھر جا دھرا

لہ پائے کوب: رقصاں



کیوں برہمن کو کہوں میں ہیچ کارہ بُت تراش
ہاتھ سے اُس کے ہُوا سنگِ گراں بھی پاش پاش
کارِ ہمّت ہے بنانا ایک پتھر سے خُدا
آہنیں بازو ہی سے آتی ہے خارہ میں خراش!



برہمن رکھتا ہے اپنی ہی نظر میں کارِ خود
غیر سے کہتا نہیں ہرگز کبھی اسرارِ خود
مجھ سے کہتا ہے سدا "اب چھوڑ دے تسبیح کو"
دوش پر ڈالے ہوئے لیکن ہے وہ زنّارِ خود!

○

برہمن بولا کہ چھوڑو غیر کی بزمِ کہن
ہیں ہماری خیر کے طالب تو یارانِ وطن!
ایک مسجد میں تو دو مُلّا سما سکتے نہیں
سحرِ بُت سے دیر میں ساکن ہیں کتنے برہمن!

تعلیم

تاب و تب دل میں ترے جب جاودانہ ہو گئی
اسپِ ہستی کے لئے وہ تازیانہ ہو گئی
اپنے بیٹے کو سکھا یہ سوزِ دل، مکتب کو چھوڑ
جس کی اب تعلیم افسون و فسانہ ہو گئی!



علمِ چارہ ساز ہو انساں کا جب بے گداز
اُس سے بہتر ہے مسلماں کی نگاہِ پاکباز
اور نگاہِ پاک بیں سے ہے کہیں بہتر وہ دل
ہو غنائے دنیا میں جس کا دو جہاں سے بے نیاز



ایسے مومن پر نہیں ہے رحمتِ حق کا گزر
رُوحِ زندہ کا نہیں ہے جسم میں جس کے گُہر
اس بنا پر مکتبِ یاراں سے کرتا ہوں گریز
اُس میں دیکھا ہی نہیں میں نے جوانِ خودنگر!

○

یاد رکھ میرا یہ نکتہ ، ایک مردِ کور چشم

ہے یقیناً ایک بینا سے غلط بیں سے بلند

یاد رکھ میرا یہ نکتہ بھی کہ اک نادان شیخ

ہے یقیناً ایک دانشمند بے دیں سے بلند!

○

اس فلک پیما تخیل سے بھلا کیا فائدہ

روز و شب رقصاں جو گردِ ثابت و سیارہ[1] ہو

ابر کے ٹکڑے کی صورت لے اُڑے جس کو ہوا

اور فضا کی وسعتوں میں دم بدم آوارہ ہو!

[1] ثابت: کھڑے رہنے والے اجرامِ فلک - سیارہ: چلتے رہنے والے اجرامِ فلک



ہے ادب ہی پیرہن ہر عاقل و بے عقل کا

خوب ہے جس نے ادب ہی سے لیا خود کو سجا

دوست میں رکھتا نہیں ایسے مسلماں زادے کو

جو بڑھا دانش میں اور انسؔ وہ ادب میں گھٹ گیا



طفلکِ ناداں سے نومیدی نہیں ہرگز روا

کچھ نہیں پروا اگر ہے عقل اس کی نارسا

ہے تجھے معلوم اگر اے شیخِ مکتب یہ بتا

دل بھی ہے سینے میں اس کے یا کہ وہ کھو یا گیا؟



تُو سِکھا اپنے پسر کو اے مسلماں عقل و دیں
تاکہ چمکے ماہ و انجم کی طرح اُس کا نگیں!
ہاتھ میں اُس کے اگر دے تُو کوئی عمدہ ہُنر
ہے یدِ بیضا سے روشن اُس کی گویا آستیں!



کر دیا نغموں سے خالی سینۂ مرغِ چمن
اور خونِ لالہ سے چھینا ہے وہ سوزِ کہن
ایسے مکتب اور دانش پر تُو کیا کرتا ہے ناز
جس نے روٹی تک نہ دی اور مار ڈالا تن میں من!



وقت اُس درویش کا رکھے پُر مسرّت اے خُدا
جس کے دم سے قلبِ ہر کس مثلِ غنچہ کھِل گیا
طفلِ مکتب کو دُعا دیتا ہے یہ مردِ فقیر
ہو نہ روٹی کے لئے محکوم یہ اغیار کا!



لَا اِلٰہ کے نُور سے جس مرد کا دِل شاد ہے
مکتب و مُلّا کے قید و بند سے آزاد ہے!
مذہب و دانش نہ کر اُس نوع کے ہرگز قبول
چشم و دست و قلب جن کے ہاتھ سے برباد ہے!



تُو نے جب دیکھا کہ بارا رہزنوں نے کارواں
تُو پوچھتا کیا ہے کہ کیسے کِس بِنا پر اور کہاں؟
علم جو تُو نے پڑھا ہے اُس سے مت بے خوف رہ
مار سکتے ہیں اُسی کے زہر سے قومِ جواں!



وہ جواں مسلم کہ تھا جو خوش گِل و رنگیں کلاہ
اور نظر بھی اُس کی تھی مانندِ شیراں بے پناہ
جب سے سیکھا علمِ بیشی مدرسے میں بیٹھ کر
اب نہیں اُس کو میسّر ایک بھی برگِ گیاہ!



ایک دن بچّہ شتر کا اُس سے بولا دشت میں
دیکھ پاتا ہی نہیں ہوں میں خُدائے چار سُو!
باپ بولا پاؤں تیرا جب بھی پھسلے گا کہیں
خود کو بھی اللہ کو بھی ہر گھڑی دیکھے گا تُو!

تلاشِ رزق

اُڑتے رہنا اس جہاں میں بام سے بالائے بام
باز کو دیتا نہیں ہرگز کوئی اعلیٰ مقام
وسعتِ افلاک میں اک مشتِ پر کے صید سے
خوب تر ہے آشیاں ہی میں تجھے مرگِ دوام!



کر تُو خود پر ایک چشمِ مہربانہ سے نظر

تازیانہ ہے نظر میری مرے ہی جسم پر

حق نے بخشا ہے مجھے جذبہ تلاشِ رزق کا

تا بہانہ ہو یہی بہرِ کشادِ بال و پر!

مگرمچھ اپنے بچے سے

اپنے بچے سے لگا کہنے نہنگِ تیز گام

ہے کنارہ تو ہمارے دینِ آبا میں حرام

موج سے جنگ آزما ہو اور رہ ساحل سے دُور

آشیانہ ہے ہمارا اے پسر دریا تمام!



تُو نہیں دریا میں، ہے دریا کا حامل بر[1] ترا
اور لڑنا دم بدم طوفاں سے ہے جوہر ترا
ایک لمحے کو تلاطم کا عمل گر چھوڑ دے
پھر تو بن جائے گا یہ دریا ہی غارت گر ترا

خاتمہ

ساقی و صہبا کی باتوں سے مجھے ہے اجتناب
مَیں نے بے باکی سے کی ہے رمزِ اُلفت بے حجاب
جو بھی اُمّت کے بزرگوں سے سُنا، مَیں نے کہا
شوخیِ رندانہ سے، جس کا نہیں کوئی جواب!

[1] بر: بمعنی سینہ



اپنی عظمت کو سمجھ، دامانِ اہلِ دل پکڑ
چاہیئے منزل تو اپنے سینے میں منزل پکڑ
کشتِ فطرت کو تُو کر سیراب اپنے خون سے
مَیں نے تو دانے بکھیرے اور تُو حاصل پکڑ!



جس کو کہتے ہو حرم، ہے قبلۂ قلب و نظر
اور طواف اُس کا نہیں ہرگز طوافِ بام و در
درمیانِ کعبہ و اقبال ایسی رمز ہے
جس کی جبریلِ امیں کو بھی نہیں اب تک خبر!

حضورِ عالمِ انسانی

آدمیّت کے ہیں معنی آدمی کا احترام
آدمی کا اِس لئے پہچان اے غافل مقام

حضورِ عالمِ انسانی

آ کبھی ساقی اور اپنے ساتھ لا وہ کہنہ مے
ہو جوانِ فرودیں[1] جس کے اثر سے پیرِ دے[2]
کر عطا سینے کو میرے وہ نوائے شعلہ ریز
مثلِ مشعل جل اُٹھے جس کی تپش سے چوبِ نے

۱؎ فرودیں: بہار - جوانِ فرودیں: تر و تازہ جوان ۔
۲؎ دے: خزاں: پیرِ دے: پیرِ کہن سال - ناکارہ بڈھا ۔



چھوڑ دے اب حجرۂ خلوت کو اور جلوت میں آ
اور کر بادِ سحر پہ سینۂ ویراں کو وا
گلشنِ عالم میں غافل نغمہ زن ہو چار دن
اور بقدرِ نالۂ بلبل خروش اس کا بڑھا



دہر نے فتنے کئے کافی بپا اور چل دیا
ناکسوں کی پرورش کرتا رہا اور چل دیا
اپنی چنگیزی سے صدہا بصرہ و بغداد کو
مثلِ گورِ تیرہ بختاں کر دیا اور چل دیا



لے گئے کتنے ہی انساں قلب میں فردا کا غم
حالِ فردا کو نہ دیکھا تھا کہ لی راہِ عدم
ہیں وہی مردانِ حق، جو دامنِ امروز میں
تازہ ہنگامے بپا کرتے رہے ہیں دم بدم



مثلِ بلبل تیرے ہونٹوں پر نہیں ہے آہِ زار
کیونکہ ہے آباد تن میں روحِ زندہ کا شرار
گلشنِ عالم میں کی فطرت نے گلچینی حلال
جسم پر تیرے مگر اک بھی نہیں ہے زخمِ خار



اپنے باطن ہی میں ہر دم پیچ کھانا سیکھ لے
سینے کو ناخن سے لالہ گوں بنانا سیکھ لے
گر تمنا ہے کہ دیکھے تو خدا کو بے حجاب
فاش تر کرنا خودی کو، خود کو پانا سیکھ لے!



کر نہ ہرگز شکوۂ جور و جفائے روزگار
جو حوادث کو نہ دیکھے ہے وہ خام و کم عیار
دیکھ اے غافل کبھی پتھر پہ آبِ جوئبار
اس کی رفتار اور منظر کس قدر ہے خوشگوار!



گنبدِ مسجد پہ اپنے بچّے سے بولا حمامؒ
نرم خوئی سے نہ کرنا اپنی ہستی کو تباہ
وردِ 'یاھو' عشق کی مستی میں گر کرتا رہا
چھین لے گا ایک دن تو باز کے سر سے کلاہ!



تو مقامِ کبریا سے ایسی پستی میں گرا
ہر ذلیل و بدعمل کے سامنے جا کر جھکا
اصل میں شاہیں ہے تو محفوظ رکھ اپنا جلال
گر بلندی چاہتا ہے دام میں اپنے ہی آ

ؒ حمام : کبوتر ۔



وہ مبارک دن ہے جب ہو تو خودی سے نورگیر
ہے یہی وہ فقر کرتا ہے جو مفلس کو امیر
ہو یقیں دل میں تو پائے گا حیاتِ جاوداں
جب کرے گا شک تو دستِ موت میں ہوگا اسیر!



ہے مری مانند ابھی تیری خودی زیرِ حجاب
خوب ہے اب بھی اُلٹ دے گر تو باطن سے نقاب
تجھ کو کافر کر رہی ہے ہر گھڑی فکرِ معاش
کر گیا کافر تجھے لیکن فقط علمِ کتاب!



اونٹ نے بچے سے اپنے کس قدر اچھا کہا
ہے مبارک جو کرے خود دہر میں ہر کارِ خود
ہم کہن صحرا نوردوں کی نصیحت یاد رکھ
پیٹھ پر اپنی ہی لے کر چل ہمیشہ بارِ خود!



یاد ہے مجھ کو کہ اکثر ایک دانائے فرنگ
کھولتا رہتا تھا مجھ پر عقدۂ بود و عدم
میں سناتا ہوں مگر اک نکتۂ حکمت تجھے
جو کہ مجھ سے کہہ گیا ہے پیرِ دانائے عجم



جاہلوں کے ہاتھ سے کرتا ہے تُو خود پر ستم
پیروی سے نفس کی سہتا ہے دِل پر جور و غم
مفتی و مُلّا کی تاویلات سے بہتر ہے یہ
مردِ خود آگاہ کی مجلس میں تُو بیٹھے دو دم!



یہ ہے فطرت کی حقیقت یا نمودِ سرسری؟
فلسفی نے کون سے کھولے ہیں رازِ زندگی؟
لکھ تو دی ہے گو فنِ غوّاصی پر اُس نے کتاب
خود مگر اک بار بھی دریا میں غوّاصی نہ کی!



ضربِ تیشہ سے تو کر دے بیستوں[1] کو پاش پاش
کیونکہ فرصت ہے تری تھوڑی مگر گردوں دو رنگ!
فلسفی کو غرق رہنے دے سدا اس بحث میں
ہے شرارِ جستہ کی بنیاد تیشہ یا کہ سنگ؟



ہاتھ سے ہرگز نہ رکھ غافل چراغِ آرزو
اور کر ہمت سے حاصل پھر مقامِ ہاؤ ہو!
چارسوئے دہر میں ہستی نہ کر اپنی فنا
رہ خودی سے باوفا اور توڑ قیدِ چارسو!

[1] بیستوں: نام پہاڑ کا جس کو فرہاد نے عشقِ شیریں میں تراشا تھا۔



تیری جنبش سے دلِ دریا سکوں بیگانہ ہے
جیب میں اُس کی تجھی سے گوہرِ یک دانہ ہے
ہو کبھی ضائع نہ تیرا اضطراب اے موج دیکھ
تیری بیتابی ہی دریا کی متاعِ خانہ ہے!



جذب کر لے اپنے سینے ہی میں تو ہر دو جہاں
ہو نہ اے ناداں اپنے حُسنِ باطن سے رواں
توڑنا مشکل ہے جب باطن سے رشتہ حال کا
شوکتِ امروز نورِ دوش سے کر دے عیاں!



اے گُلِ لالہ کیا ہے مجھ پہ تُو نے سینہ وا
اور عیاں میری نظر پر چہرۂ زیبا کیا
جب تُو نکلا شاخ سے لالہ تجھے کہنے لگے
شاخ کے اندر تھا کیونکر اور کیا؟ آشنا بنا!



وجہِ گریہ مرد کی ہرگز نہیں ہے رنج و درد
اور حوادث سے نہ اُس کے قلب پر بیٹھے گی گرد
اُس کے رونے کو نہ کر تُو اپنے رونے پر قیاس
سوز و مستی سے ہُوا کرتا ہے گریاں شیرِ مرد!



موت پا کر بھی نہیں مرتا ہے مردِ امتحاں
جاوداں ہے مر چکا ہے گو وہ زیرِ آسماں
ہے تری ہستی کے شایاں موت کی یہ رسمِ عام
ورنہ تو اک قطرۂ ہلکی بھی دے سکتا ہے جاں!



خاکِ تن تیری جو سوزِ جاں کی محرم نہیں
ابرِ نیساں سے تری شاخوں میں بالکل نم نہیں
غم سے تو آزاد رہ کر تارِ دم پر رکھ نظر
کیونکہ تر سینہ ہو پر دم اُس میں راہِ غم نہیں!



میں غمِ باطن سے ہوں ہر لحظہ دنیا میں تپاں
اور نامحرم ہیں اس غم کے شریکِ رازداں
تو بنا لے قصرِ مستقبل کو کر لے استوار
گر تجھے ہے ترے دم کا بہا[1] آشکار



جس نے اپنی ذات ہی سے دل لیا اپنا لگا
بحر و دریا میں بھی وہ بے خوف و بے خطر رہا
گو نظر پر جلوۂ ہستی کر دی فطرت نے حلال
وہ محافظ پھر بھی ہر دم اپنے قلب و دست کا

[1] بہا : قیمت



قلب میرا ہے سدا ایسے ہی غم سے دردمند
جس کی ہے بنیادِ آئی سمورش کی نہاک نژند[۱]
اس غمِ شیریں سے ہم ہنستے ہیں لیکن بے خبر
جس کی اصلِ پاک ہے دنیا میں افکارِ بلند!



کہہ نہ تو ہرگز، خدا نے مجھ کو بخشا رنج و درد
ہے جو ہمت جھاڑ سکتا ہے تو دل سے غم کی گرد
اس جہاں کو کر تہ و بالا کہ جس کے کھیل میں
جیتنا نامردی ہے اور ہار کھا جانا ہے مرد!

۱۔ نژند: خوار و خراب۔



اپنے سینے میں نہ رہنے دے تُو کینے کا اثر

جب دھواں[1] بھر جائے گھر میں کھول دے سب بند در

کشتِ دل سے دے نہ تُو ہرگز کسی کو بھی خراج

وہ خدایا[2] اپنے گاؤں کو تُو خود ویراں نہ کر!



صبح کی تخلیق اُس کی آستینِ شب سے ہے

اور فروغِ ہر دو عالم بھی اُسی کوکب سے ہے

اس سے بہتر کیا بتاؤں مردِ مومن کا نشاں

وقتِ مُردن اک تبسم ظاہر اُس کے لب سے ہے!

لہ یہاں کینے کو دھوئیں سے تشبیہ دی ہے۔ ٢ہ وہ خدا: گاؤں کا مالک۔



اوس بادِ صبح سے کہنے لگی با اشک و آہ
رحم کر کہ میں تجھ سے ہی رکھتی ہوں امیدِ نگاہ
صحبتِ گل سے تو میرا دل فسردہ ہو چکا
اس طرح چل اب کہ لے آغوش میں مجھ کو گیاہ!

دل

دلِ وہ قلزم ہے کہ ساحل سے ہے جس کو اجتناب
خوف سے اس کے نہنگوں کا ہے زہرہ آب آب
دشتِ صدہا ڈوبتے ہیں قلب کی جس سیل میں
ہے فلک بھی اس کی پہنائی میں گویا اک حباب



قلب میرا آگ ہے اور جسم گویا موجِ دود
دم بدم سوز و تپش اس دل کا ہے سازِ وجود
اس کے اطمینان کا باعث ہے ذکرِ نیم شب
جس طرح پارے کی تسکیں کا سبب ہے چوبِ عود



وقت کرتا ہے عطا اس کو ترقی بیش بیش
کیونکہ مردِ خود نگر فطرت میں ہے درویش کیش
فقر میں شاہی جو چاہے دل پہ رکھ ہر دم نظر
جس طرح ہیں بحر کے قبضے میں گوہر ہائے خویش!



وہ نہ کر سکتا حوادث سے خودی کا امتحاں
اور نہ بن سکتے ہو سکتے رہا قلب و زباں
عقل اک زنجیر ہوتی آدمی کے واسطے
قلب زندہ اُس کے سینے میں نہ گر ہوتا نہاں



تُو یہ کہتا ہے کہ ہے بنیاد دل کی خاک و خُوں
اور یہ ہے ہر دم گرفتارِ طلسمِ کاف و نُوں[1]
قلب میرا گرچہ ہے آباد سینے میں مرے
لیکن اس پر بھی جہانِ آب و گل سے ہے بروں!

[1] کاف و نون: کُن یعنی ہو جا۔ مراد عالم کون و فساد جو خدا کے حکم "کُن!" سے پیدا ہوا۔

○

حل ہر اک عقدے کا اِس جا قلب کی زاری سے ہے
اور فروغِ مہر و مہ بھی دِل کی زنّاری[1] سے ہے
دو مرا پیغام جا کر اہلِ ہندوستان کو
گر غلام آزاد ہے تو دِل کی بیداری سے ہے

○

ہم بھی ہیں کشتِ یزداں کا حاصل ہے دِل
اور عروسِ زندگی کے واسطے محمل ہے دِل!
اِس کی صحبت سے غبارِ راہ ہے دانائے راز
عقل بیچاری کی یہ قسمت کہاں یہ دِل ہے دِل!

[1] زنّاری : بمعنی پابندی و اسیری ۔



گاہ میرا قلب ہے، جو بندۂ حسنِ غریب
گہ خطیبِ خوش نوا ہے جس کا منبر ہے صلیب
اور کبھی یہ دل ہے اک سلطانِ با خیل[1] و سپاہ
جو مگر رہتا ہے خود دولت سے اپنی بے نصیب!



دِل کی دنیا کو نہ سمجھو اک جہانِ رنگ و بو
اِس میں پاؤ گے نہ تم پست و بلند و کاخ و کو
دل کے عالم میں نہیں ہیں چرخ و زمیں و چار سو
اِس میں کوئی چیز ہے بھی تو فقط اللہ ھو

[1] خیل : لشکر



عقل نے پیدا کئے پیمانہ ہائے آرزو
تاکہ نا پے اُس سے پہنائے جہانِ چارسُو
رندِ مے آشام نے، جس کو کہا کرتے ہیں دِل
اپنی تہ میں غرق کر ڈالا جہانِ رنگ و بُو



کس کو کہتے ہیں محبّت؟ ہے یہ تاثیرِ نگاہ!
زخمِ شیریں دل کو کرتا ہے عطا تیرِ نگاہ
صیدِ دل کے واسطے جاتا ہے؟ ترکش پھینک دے!
کیونکہ نخچیر[1] ہے دراصل نخچیرِ نگاہ!

[1] نخچیر: شکار۔

خودی

منبعِ نورِ خودی ہے نورِ ذاتِ کبریا
وہ رسا ہوتی ہے جب ہو عشق اُس کا نارسا
ہجر کو اُس کے جنم دیتا ہے خود ذوقِ وصال
وصل پالیتی ہے، جب دلبر سے رہ جائے جُدا



چھوڑ کر جب گفتگو ہو قوم گرمِ جستجو
خاکِ تن سے اُس کی اُگتا ہے نہالِ آرزو
آرزو ہی سے خودی تیری ہے وہ تیغِ اصیل
دھار جس کی کاٹ دے اک دم میں گُل سے رنگ و بُو



ہے وجودِ حق ہی سے ثابت خودی کا بھی وجود
اور نمودِ حق سے ہوتی ہے خودی کی بھی نمود
سینۂ انساں میں ہے روشن خودی کا جو گہر
کس جگہ کرتا وُہ گھر، دریا کی گر ہوتی نہ بُود[1]



قلبِ مومن صحبتِ گِل کا کرے جب التزام
اک جمود و خواب طاری اُس پہ رہتا ہے مدام
حاکمِ تن ہے جو مَن، تو قلب بھی بیدار ہے
مَن ہُوا محکومِ تن تو چھا گئی مرگِ دوام!

[1] بود: بمعنی ہستی۔



وصل بھی ہے وصل جب وہ ہجر سے ہو بہرہ ور
یہ وہ عقدہ ہے جسے کرتا ہے حل سوزِ نظر!
گرچہ گوہر ہو چکا آغوشِ دریا ہی میں گم
آبِ دریا کو مگر کہتے نہیں آبِ گہر!



خاکِ تن مجھ کو ملی ہے قلب کی درگاہ سے
اور اسی کے ابرِ تر سے میرے گل پیدا ہوئے
میں "من" و "او" کو نہیں پہچانتا لیکن یہ سُن
ہے مرا "من" بھی نہاں اندر اسی آغوش کے!

جبر و اختیار

بالیقیں زندہ کرے گا ایک دن سب کو خدا

اور قیامت میں لگائے گا ترازو عدل کا

ہے مگر یہ ڈر مجھے ہو گی نہ ہرگز سازگار

مجھ کو اور خالق کو میرے پرسشِ روزِ جزا[1]



ایک راہب نے کہا رو ما میں شفقت سے مجھے

نکتۂ روشن مرا سن اور گرہ میں باندھ لے

وہ میں ہر قوم اپنی موت کا باعث ہے خود

مر گئی تقدیر سے کوئی، کوئی تدبیر سے!

[1] مفہوم و مقصد بالکل یہ ہے کہ :

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل — آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

موت

ایک دن بولی خدا سے موت ہو کر سوگوار
نور و نم سے ہے تہی انساں کی چشمِ بے وقار
مجھ کو اس صیدِ زبوں کی جان لینا بھی ہے عار
موت کے حملے سے لیکن وہ نہیں ہے شرمسار!



بے ثبات انساں کو، وہ ہے اسیرِ شش جہات
اور اُسی نے تھام رکھی ہے زمامِ کائنات
موت کی خواری سے ہوتا ہی نہیں وہ شرمسار
کیونکہ اس کی چشم سے مخفی ہے ناموسِ حیات!

بگو ابلیس را

کوئی دے اقبال کا ابلیس کو جا کر پیام
کب تلک تڑپا کرے گا دہر میں تو زیرِ دام
خوش نہ آیا مجھ کو تو اللہ کا یہ خاکداں
ہر سحر جس کی ہوا کرتی ہے اک تمہیدِ شام



جب کہ دُنیا نے نہیں پہنا تھا جامہ زیست کا
اُس کا دل قعرِ عدم میں سرد و بے ہنگامہ تھا
سوز تھا کس چیز میں اُس جا مری جاں کے بغیر؟
تجھ کو بھی حق نے مری ہی آگ سے پیدا کیا!



عِشق کو حق نے جُدائی سے کیا روشن بصر
اور جُدائی ہی سے میرا شوق ہے جوئندہ تر!
تُو ہی جانے ہجر سے اب ہے ترا احوال کیا
مجھ کو آب و گِل نے مجھ سے کر دیا ہے باخبر!



حق نے تجھ کو اپنے در سے تا ابد بے حق کیا
اور رحیم و کافر و طاغوت بھی تجھ کو کہا
دِل میں میرے رکھ دیا تھا اُس نے جو خارِ فراق
ہے خلش اُس کی مجھے سرچشمہ سوز و ساز کا!



جانتا ہے خُوب تُو میرے صواب و ناصواب
دانہ نیکی کا نہیں دیتی مری کشتِ خراب
منکرِ سجدہ ہُوا تُو، دردمندی سے مگر
اپنے سر لیتا ہے اب میرے گناہِ بے حساب!



آکہ کھیلیں نرد شاہی شان سے مَیں اور تُو!
موم کر دیں سوز سے اپنے جہانِ چارسو!
حسبِ اعجازِ ہُنر اک دم میں برگِ کاہ سے
چرخ کے نیچے بنائیں اک جہانِ رنگ و بُو!

ابلیسِ خاکی و ابلیسِ ناری

ہے فسادِ عصرِ حاضر ہر بشر پر آشکار
زشتی و پستی سے اِس کی چرخ بھی ہے شرمسار
بہرِ حق پیدا کرے گر آج بھی ذوقِ نگاہ
سیکڑوں شیطان بن جائیں ترے خدمتگزار!



ہر قدم پر ہیں جہاں میں رہزنانِ چشم و گوش
جو دلوں کو لوٹنے میں ہیں نہایت سخت کوش
کوڑیوں میں دے رہے ہیں وہ گراں قیمت گناہ
کیونکہ یہ سوداگرانِ فسق ہیں ارزاں فروش!



یہ ہے شیطاں؟ چال بھی جس کی ہے دائم واژگوں[1]!
تجھ کو اندھا کر رہا ہے اُس کا ہر مکر و فسوں
عندیے میں میرے وہ شیطان یکسر مردہ ہے
صید جو کرتا ہے آکر تجھ سا نخچیرِ زبوں[2]!



کس بلا کے زہر سے اُس کا بھرا پیمانہ ہے
بہرِ جاں مہلک ہے، تن اُس سے مگر بیگانہ ہے
تُو نے بے شک دیکھ ڈالا حلقہ اُس کے دام کا
دام وہ دیکھا نہیں لیکن جو زیرِ دانہ ہے!

[1] واژگوں: اُلٹی / ٹیڑھی۔ [2] نخچیرِ زبوں: لاغر شکار۔

○

جب سے پیدا ہو گیا انساں کی فطرت میں فساد
حسبِ ظرف و قوّت اُس نے دہر میں پائی کُشاد
پھر گناہوں میں بھی لذّت اور تپش ہو گی کہاں
جب گنہگاروں کا ہو ابلیس ہی خاکی نہاد

○

عصرِ حاضر کے شیاطیں کا نہ ہو ہرگز شکار
پست لوگوں کے لئے ہے اُن کا غمزہ سازگار
ہے وہی شیطان خوشتر بہرِ مردانِ اصیل
جو ہے پہلے دن سے یزداں دیدہ و کامل عیار[1]

[1] کامل عیار: کھرا، اصلی؛



ہے حریفِ ضرب اُس کا دہر میں مردِ تمام
کیونکہ وہ آتش نسب ہے محکم و والانقام
ہر کس و ناکس کو وُہ کرتا نہیں اُٹھ کر شکار
صیدِ لاغر کو سمجھتا ہے وہ اپنے پر حرام!



دُوں نہادوں کی سمجھ سے گرچہ یہ نکتہ ہے دُور
اہلِ دانش کے لئے کہنا بھی ہے اِس کا ضرور
عصرِ حاضر کے شیاطیں سے کرے گا اجتناب
ہر وہ عاصی، دی ہے جس کو حق نے اِک طبعِ غیور!

بہ یارانِ طریق

آتشِ اُمّت میں لائیں پھر عمل کا سوز و ساز
ہو قمارِ زیست میں جراءت ہماری وجہِ ناز
نالہ کش اِس درد سے ہوں شہر کی مسجد میں ہم
جس سے دِل مُلّا کے سینے میں کبھی ہو جائے گداز

بہ یارانِ طریق

تُو قلندر کو سمجھ اک جرّہ بازِ آسماں
اُس کے بال و پر پہ ہلکا ہے اِک بارِ گراں
وسعتِ افلاک ہے اُس باز کی نخچیر گاہ
وُہ نہیں اُڑتا کبھی پستی میں گردِ آشیاں



روح سے اٹھتا ہے میری نغمۂ اللہ ھُو

جھڑ رہا ہے رختِ ہستی سے غبارِ چار سُو

ساز میرے ہاتھ سے لے کیونکہ اُس کا تار تار

سوزِ زخمہ سے گرا ہے مثلِ اشکِ آرزو



میں دلِ فطرت میں مثلِ اشک مضطر ہی رہا

اِس تپش نے چشم تک اُس کی مجھے پہنچا دیا

ہے تجلی ہی مری مژگانِ فطرت کا فروغ

بھول کر بھی میں نہ برگِ کاہ پر جا کے گرا

○

آرہی ہے مطبخِ منطق سے مجھ کو بُوئے خام
جو دلیل اُس نے سُنائی، تھی دلیلِ ناتمام
کھولتے ہیں مجھ پہ اسرارِ ازل کے بند در
شعرِ پیرِ رُوم[1] یا گفتارِ مولانائے جام[2]

○

آ مری محفل میں اور لے وہ شرابِ کہنہ سال
رُوحِ روشن جس سے پا لیتا ہے اِک جامِ سفال
میرے شیشے سے جو اُس کی آبیاری تُو نے کی
شاخِ لالہ بھی اُگے گی قدِ آدم کی مثال!

[1] مولانا جلال الدّین رومی۔ [2] مولانا عبدالرحمٰن جامی



آج کل ہے ہاتھ میں میرے وہی دیرینہ چنگ
جس کے پردوں میں ہیں پنہاں نالہ ہائے رنگ رنگ
شیر کے ناخن سے لیکن میں بجاتا ہوں اسے
تار ہیں اِس ساز کے سب صورتِ رگ ہائے سنگ



وقت کے پرویز جتنے ہیں انھیں جا کر کہو
جب نہیں ہیں کوہکن، کیوں ہاتھ میں تیشہ رکھوں!
جو مگر سینے میں چبھتا ہے مرے، اُس خار سے
چیر سکتا ہوں میں لمحے میں دلِ صد بیستوں[1]!

[1] نام پہاڑ کا جسے فرہاد نے تراشا تھا۔



ہے فقیری ساز میرا اور ساماں بے نگاہ
کوہِ یاراں بھی ہے میری چشم میں اک برگِ کاہ
زاغ مرگھٹ کا بھی بہتر ہے ہزاروں مرتبہ
ایسے شاہیں سے رہا ہو جو کہ دست آموزِ شاہ[1]



واسطے سب کے کھلا رہتا ہے میرے دل کا باب
بے سبب کرتا نہیں ہوں میں کسی سے اجتناب
سینے میں اپنے بنایا میں نے اپنا آشیاں
اور زیرِ چرخ کاٹی عمر بے رنج و عتاب

[1] دستِ آموزِ شاہ : بادشاہ کے ہاتھ کا سدھایا ہوا ۔



گلشنِ عالم میں میں رکھتا نہیں کچھ آب و جاہ
اور مری قسمت میں آئی نے قبا اور نے کلاہ

نزدِ گلچیں ہے "بدآموزِ چمن" میرا خطاب
کیونکہ میں نے ہی عطا کی چشمِ نرگس کو نگاہ!



سیکڑوں دانا جہاں میں کہہ گئے آکر سخن
ہیچ تھا اُن کے سخن کے سامنے برگِ سمن!

تو ہی کہہ انصاف سے ہے کون ایسا دیدہ ور
دیکھ کر کانٹے کو جو بتلا گیا حالِ چمن!



جانتا کچھ بھی نہیں ہیں نکتہ ہائے علم و فن
ہاں مری گفتار سے کچھ اور ہے شانِ سخن
کارواں میں ہے مرے ہی شعر کا یہ سوز و ساز
تیز تر جس سے ہوئی رفتارِ پیرانِ کہن



مت سمجھ مجھ کو کہ ہوں میں ایک مُرغِ صبح خواں
جو نہیں کچھ جانتا دُنیا میں جُز آہ و فغاں
تھام لے دامن مرا گر چاہتا ہے تُو بہار
آشیاں میں میرے رکھّی ہے کلیدِ گلستاں!



کچھ نہیں میری نظر میں یہ جہاں جز رہگذر

ہیں ہزاروں راہرو، لیکن نہیں اک ہم سفر!

ہے ہجوم اقربا، سے مجھ کو ہر لمحہ گریز

خویش سمجھا تھا جنھیں، ہیں مجھ سے وہ بیگانہ تر!



گرچہ فانی ہے تری ہستی، سمجھ رازِ بقا

اور بازارِ جہاں میں اپنی قیمت کو بڑھا

غوطہ زن ہو اے مسلماں میرے بحرِ نغمہ میں

آ، مثالِ دُر مرے طوفان میں آرام پا!

○

پرورش کا میری گو مرکز رہا یہ خاکداں

ہوں مگر منزل کو پانے کے لئے ہیں دلِ گراں[1]

فیضِ نم نے اس زمیں کے گو اُگایا ہے مجھے

اس زمیں کو کہہ نہیں سکتا ہیں اپنا آسماں

○

زندگی ہے قلب کی مردانِ مومن ہی کا دم

کیونکہ ہے خود اُن کا دِل دُنیا میں رشکِ جامِ جم

رکھتے ہیں محفوظ وُہ غم کو بھی آہ و نالہ سے

صابر و خوددار ہے اُن کی طرح سے اُن کا غم!

[1] دِلِ گراں : اداس ، بے چین

○

ہو نظر حاصل تو دیکھے صاف تُو رُوحِ بدن
اور شاخوں میں بھی دیکھے نادمیدہ یاسمن!
یہ اگر ممکن نہیں تو صورتِ تیرِ کماں
دیکھ تُو اپنے ہدف کو با نگاہِ تیر زن!

○

عقلِ بے تنویر ہے بیگانۂ ذوقِ یقیں
اور قمارِ علم و حکمت ہے قمارِ بدنشیں[1]
سیکڑوں بوحامد و رازی ہیں پستُ بے وقار
پیشِ ناداں جس کو حق نے دی ہے چشمِ راہ بیں!

[1] قمارِ بدنشیں: وہ جُوے باز جو دیانتداری سے نہ کھیلے اور مکر و فریب سے کام لے۔ "قمار" اس مصرع میں بمعنی قمار باز مستعمل ہُوا ہے۔

○

ہیچ ہیں اُن کی نظر میں نقرہ و لعل و گہر
ہیچ ہیں قصر و غلامِ خوش گِل و زرّیں کمر
مثلِ یزداں خود بھی ہیں وہ دو جہاں سے بے نیاز
پس یہی دُنیا میں ہے سرمایۂ اہلِ ہُنر!

○

ہے خودی کے واسطے مستی بھی میری عین ہوش
اس بِنا پر ہے مرا مے خانہ دائم بے خروش
گرچہ ہے تا اصافِ میری مے تو اُس کو پی بھی جا
کیونکہ یہ تلچھٹ بھی ہے تہ جرعۂ خم ہائے دوش[1]!

[1] تہ جرعۂ خم ہائے دوش: گزشتہ رات کے خم کا باقیماندہ گھونٹ۔



خرقہ و عمامہ میں ہر دم رہا تو محوِ کار

اور پائی میں نے اپنے قلب سے بوئے نگار[1]

ہے یہی اک چوبِ نے سرمایۂ نغمہ مرا

چوبِ منبر سے غرض ہے اور نہ مقصد چوبِ دار



جب سے دیکھا میں نے اپنے جوہرِ آئینہ کو

اپنی خلوت گاہ ٹھہرایا ہے اپنے سینہ کو

محفلِ دانشورانِ کور و مردہ رُوح سے

ہیں کنارہ کش ہوا لے کر غمِ دیرینہ کو!

[1] نگار: معشوق

○

باندھ کر بستر جہاں سے جب میں رخصت ہو گیا
ہر کوئی بولا کہ تھا اقبال میرا آشنا
اِس قدر سمجھا نہ کوئی چھوڑ کر رسمِ نمود
وُہ کہاں سے آیا، اُس نے کیا کہا کس سے کہا

○

فضلِ حق سے ہو اگر دانا دل و صافی ضمیر
ہے فقیرِ بے نوا بھی رشکِ سلطان و امیر
منعمِ بے دین و بے عقل و خرد کے دوش پر
جامۂ اطلس نہیں ہے، بلکہ پالانِ حریر[1]!

[1] حریر: ریشم۔



سجدہ کرتا ہے تُو غافل پیشِ ہر دارا و جم
ذلّت و نکبت سے تیری ہو گیا رُسوا حرم
سامنے انگریز کے حاجت نہ کوئی پیش کر
اپنے طاقِ دل سے تُو فوراً گرا دے یہ صنم



ایک بوڑھے نے سُنایا مجھ کو شعرِ دلپذیر
تھا وہ دانا و حکیم و خوش دل و روشن ضمیر
جس نے ناداری میں رکھی اپنی خودداری کی شان
ہر دو عالم پر ہُوا قابض یقیناً وہ فقیر!



ہے دو حرفوں میں نہاں اہلِ عمل کا سرِّ کار
جلوۂ موزوں عشق کی منبر نہیں ہے بلکہ دار!
ڈر نہیں سکتا کبھی نمرود سے قلبِ خلیلؑ
دہر میں ہوتی ہے عودِ خام کا آتش عیار[1]



ڈھونڈ مت اِس باغ میں اے لالہ کوئی غمگسار
ہے مری مانند تیرا دل ہی تیرا یارِ غار
جو ہوا بھی آئے اُس پر اپنا سینہ کھول دے
لیکن اپنے داغِ کہنہ کو نہ کھونا زینہار!

[1] عیار: کسوٹی، مراد امتحان۔



دو نصائح یاد ہیں اک پیرِ دانا کی مجھے
جان سے اپنی ہی کر ہستی کی روشن انجمن
کر تُو ایسے مردِ دُوں فطرت کی محفل سے گریز
جاں کو گروی کر کے جو زندہ رہا با خاکِ تن



ایک دِن کہنے لگی ساحل سے موجِ بے قرار
مَیں کسی فرعون سے کرتی ہوں قوّت کا عیار[1]
اپنی ہستی ہی میں پیچاں ہوں کبھی میں مثلِ مار
اور کبھی رکھتا ہے رقصاں مجھ کو ذوقِ انتظار

۱ عیار بمعنی امتحان



گر فرنگی ہی سے پایا تو نے یہ سب مال و زر
رکھ اُسی کے آستانے پر ہمیشہ اپنا سر
بلکہ بہتر ہو کہ اُس کی چوب پر رکھ دے سرِیں
خر پہ حق رکھتا ہے آخر کچھ نہ کچھ پالان گر!



ایک دل بھی تو نہیں انگریز کے زیرِ نگیں
ملک ہے مقصود اُس کا طاعتِ مذہب نہیں
ہے وہ اک ایسا خدا جس کے حرم کے طرف میں
سب کے سب شیطان ہیں اک بھی نہیں روح الامیں!



میں بھی اور تُو بھی ہیں اب تو دین و دل سے نا امید
مثلِ بُوئے گُل ہوئے ہیں اصل ہی سے ناپدید
دِل مرا اور اس کے مر جانے سے دیں بھی مر گیا
ایک سودے میں دو موتیں ہیں، جو ہم نے لیں خرید



جو مسلماں بھی سمجھتا ہے جہاں میں رمزِ دیں
رکھ نہیں سکتا کبھی وُہ پیشِ غیر اللہ جبیں
حسبِ منشا اس کے گر چکّر نہ کاٹے آسماں
اپنی منشا کے مطابق وُہ چلاتا ہے زمیں!



اِس دلِ بیگانہ کا مسکن نہیں یہ خاکداں
اس کے روز و شب نہیں ممنونِ دورِ آسماں
خود ہی تو تجویز کر اپنے لئے وقتِ قیام
عشق و مستی کی نمازوں پر نہیں قیدِ اذاں!



عشقِ حق حاصل نہیں ہوتا بِلا صدق و یقیں
اور یقیں ملتا نہیں بے صحبتِ روح الامیں
گر یقین و صدق سے ہے بہرہ ور تیری جبیں
رکھ دلیری سے قدم منزل میں کچھ خطرہ نہیں!

○

رمزِ لولاک[1] اُس پہ جب دُنیا میں ہو جائے عیاں
پائے مسلم نور سے اس کے حیاتِ جاوداں
گر نہیں سمجھا خدا کو، اس کی عظمت ہی سمجھ
"ما عرفنا"[2] کی حقیقت کو کیا جس نے بیاں!

○

تو بُتِ افرنگ ہی کا بندہ ہو کر رہ گیا
اور صنم خانے ہیں نامردوں کی صورت جا بجا
اس بنا پر عقل و دل تیرے ہیں بے سوز و سرور
تاک[3] سے اپنے بزرگوں کے نہ جامِ مے پیا

[1] لولاک لما خلقت الافلاک "اے نبیؐ! اگر میں تجھے پیدا نہ کرتا، تو کائنات کو بھی پیدا نہ کرتا" (حدیثِ قدسی) [2] ما عرفناک حق معرفتک "الٰہی! ہم نے تجھے اُس طرح نہیں پہچانا جس طرح پہچاننا چاہیئے تھا"۔ [3] تاک: انگور کی بیل ۔



ہر کس و ناکس نہیں ہے خود تراش و خود گداز

ہر کوئی ہوتا نہیں ہے مستِ نازاندر نیاز

خونِ مرداں سے قبائے لاالٰہ ہے لالہ رنگ

وہ تنِ نامرد پر ہے غیر موزون و دراز!



سوزِ مومن کا ہے منبع حق ہی کا سوزِ وجود

اور کشودِ حق سے ہر عقدے کی ہوتی ہے کشود

ہے قیام اُس کا جلالِ کبریا سے پُر جلال

اور جمالِ زندگی کے ترجماں اُس کے سجود!



ہیں رکوع اُس کے جو سجدوں کے مکمّل رازدار
پوچھ مت مجھ سے نمازِ عاشقانہ کا خمار
کس طرح اُن کو سمیٹے گی نمازِ پنج وقت
ہیں نہاں "اللہ اکبر" میں جو مستی کے شرار!



اُس کی قرأت میں ہے مخفی دعوتِ ہر دو جہاں
بہرِ مسلم اُس کی رکعت ہے حیاتِ جاوداں
پا نہیں سکتا اُسے یہ کشتۂ عصرِ رواں
حرفِ "قد قامت" میں جیسا شورِ محشر ہے نہاں!



ہے فرنگ آئینِ رزّاقی سے پورا باخبر
ایک کو دیتا ہے روٹی دوسرے سے چھین کر
اس طرح روزی عطا کرتا ہے وہ شیطان کو
ایک حیرت جس سے چھا جاتی ہے خود رزّاق پر



کیا ضرورت ہے کہ میں لمبی کروں یہ داستاں
اک دو حرفوں میں بیاں کرتا ہوں اسرارِ نہاں
دے دیا سوداگروں کے ہاتھ میں اپنا جہاں
لامکاں والے کو کیا معلوم ہے قدرِ مکاں!



ایک جنّت بن چکی ہے بہرِ پاکانِ حرم
دُوسری جنّت بھی ہے اِک بہرِ اربابِ ہمم!
اِک بہشتِ مفت بھی ہے اے تنِ آساں مسلمو!
سُست خوش اُس میں ہو اور مت کرو کچھ رنج و غم!



اُنس مومن کو نہیں ہوتا فقط تقدیر سے
اُس کی مٹّی بھی ہے زر اِس نکتے کی اکسیر سے
کوئی بھی حاصل نہ دے گی تم کو وہ کشتِ خراب
آبِ خُوں پاتی نہیں جو گردنِ شبیرؓ سے!

روحِ مشرق

(از عبدالرحمٰن طارق)

"روحِ مشرق" مکمل اور منظوم اردو ترجمہ ہے علامہ اقبال کی فارسی تصنیف "پیامِ مشرق" کا اوّل تا آخر ان تراجم میں بھی طارق صاحب نے اصل نظموں کے حقیقی مفہوم و مقصد کو کہیں بھی فوت نہیں ہونے دیا، اور اظہارِ مطالب میں قیودِ شعری مطلق حائل نہیں ہوئیں۔ وہی سلاستِ مفہوم، وہی جوش و جلال، وہی زور و دبدبہ، وہی جذبۂ حق و صداقت، وہی چستیٔ بندش وہی روانی، اور زبان و بیان کی وہی شیرینی تمام تراجم میں بھی ہر جگہ موجزن ہے جو کہ "پیامِ مشرق" میں موجود ہے۔ الغرض "**روحِ مشرق**" اردو زبان میں ایک نہایت مکمل اور حسین و جمیل عکس ہے "پیامِ مشرق" کا اور ایک ایمان افروز تحفہ ہے ہر مسلم گھرانے کے لئے آج ہی ایک جلد منگا کر مطالعہ کریں اور عین الیقین سے ہمارے بیان کی تصدیق فرمائیں۔

کتابت و طباعت نہایت عمدہ

ضخامت اسی سائز کے ۲۹۴ صفحات - قیمت مجلّد ساڑھے تین روپے

اشاعت منزل بُل روڈ لاہور

جہانِ اقبالؒ

(از عبدالرحمٰن طارق بی اے)

حکیم الامت علامہ اقبالؒ کے حیات افروز کلام پر تبصرے اور تشریح کی صورت میں آپ نے کافی لٹریچر مطالعہ فرمایا ہوگا لیکن آج ایک ایسی نادر و ممتاز دلچسپ اور عام فہم کتاب ملاحظہ فرمائیے، جس کے مضامین اپنی جدت جامعیت اور حسنِ انداز سے کلامِ اقبال کے متعلق آپ کو ایک نئی بصیرت عطا کریں گے۔ کتاب کی تعمیری اور افادی حیثیت کا اندازہ مندرجہ ذیل مضامین سے ہو سکتا ہے۔

(۱) اقبال اور نطشے (۲) اقبال اور رومی (۳) اقبال کا مقامِ خودی (۴) اقبال کا نظریۂ فقر (۵) اقبال کا معیارِ ایمان و مومن (۶) اقبال اور دین و سیاست (۷) اقبال کا تصورِ زمان و مکان (۸) اقبال اور فنونِ لطیفہ (۹) اقبال اور سیاسیاتِ عالیہ (۱۰) اقبال کا تصورِ ابلیس (۱۱) اقبال کا فلسفۂ شاہین (۱۲) اقبال کی نظر میں عورت کا مقام (۱۳) اقبال اور مسئلہ تقدیر (۱۴) اقبال بحیثیت ایک ادبی مصور کے (۱۵) اقبال کی غزل گوئی (۱۶) طنزیاتِ اقبال (۱۷) اقبال کی پیشگوئیاں (۱۸) اقبال کا غیر مطبوعہ کلام ..... مقالات کا یہ لاثانی تنوع کتاب کی جامعیت پر از خود شاہد ہے ہر مضمون کے مطالعہ سے آپ کے مذاقِ سلیم کو خاطر خواہ تسکین حاصل ہوگی۔ کتابت و طباعت نہایت خوشنما۔ سائز ۲۲×۱۶ کا۔ ضخامت چھ سو صفحات

قیمت مجلد ساڑھے سات روپے

ناشران

ملک دین محمد اینڈ سنز پبلشرز بل روڈ کشمیری بازار لاہور